مقالاتِ سیرت

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے مقدمہ کے ساتھ

مُصنّفہ

ڈاکٹر محمد آصف قدوائی

ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۹۶۷ء

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No. 080636
★ MAILSI ★

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

Masood Faisal Jhandir Library

فہرست

نمبر شمار		صفحات
۱	تعارف و پیش لفظ ___ از، ابوالحسن علی ندوی	۶
۲	پہلا مقالہ:- اسلام میں نبوت کا تصور	۱۵
۳	دوسرا مقالہ:- حیاتِ طیبہ (۱)	۴۵
۴	تیسرا مقالہ:- حیاتِ طیبہ (۲)	۸۱
۵	چوتھا مقالہ:- معجزے	۱۱۷
۶	پانچواں مقالہ:- خلقِ عظیم	۱۳۹
۷	چھٹا مقالہ:- پیغمبرِ اسلام اور تلوار	۱۷۷
۸	ساتواں مقالہ:- کامیاب ترین پیغمبر	۲۰۱
۹	آٹھواں مقالہ:- سرورِ کائنات	۲۲۵
۱۰	ضمیمہ (۱):- چند خطبے	۲۴۷
۱۱	ضمیمہ (۲):- حدیثیں	۲۶۱
۱۲	ضمیمہ (۳):- دُعائیں	۲۶۹

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ناشر

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام
ندوۃ العلماء لکھنؤ

مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ

بار اوّل	سنہ ۱۹۵۹ء	ایک ہزار
بار دوم	سنہ ۱۹۶۷ء	ایک ہزار
قیمت مجلد مع گرد پوش		پانچ روپے

جنوری سنہ ۱۹۶۷ء

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا

(خدایا اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو دارو گیر نہ فرما)

محمد آصف قدوائی

کچہری روڈ، لکھنؤ

۱۰ر جولائی ۱۹۵۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف و پیش لفظ

الحمد للہ وکفی وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

نوع انسانی کے پاس خالق کائنات کے عطیوں اور صنعتوں میں سے سب سے زیادہ حسین، سب سے زیادہ باوقار، سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ پرفیض عطیہ اور شاہکار ان پیغمبروں کی سیرت اور ان کا اصلاحی کارنامہ ہے جن کو وہ وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں میں پیدا کرتا رہا ہے، انسانیت کی عزت و آبرو انہی کے سیرتوں سے قائم ہے۔ اگر انسانیت کے مرقع سے انکو علیٰحدہ کر دیا جائے تو دنیا کی تاریخ نائے و نوش، ہوا و ہوس، خود غرضی و خود مطلبی، جنگ و جدال، اوہام و خرافات، اور جہالت و ضلالت کی داستان بنکر رہجاتی ہے جس میں کہیں کہیں رشد و ہدایت کے دیے ٹمٹماتے نظر آتے ہیں، انکے متعلق بھی جب تحقیق کیجاتی ہے تو انکی روشنی کی تاریخ بھی کسی پیغمبر برحق کی تبلیغ و ہدایت اور جد و جہد سے وابستہ نظر آتی ہے۔ ان چراغوں کی حقیقت بھی گمراہی اور

جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں اس سے زیادہ نظر نہیں آتی کہ برسات کی اندھیری رات میں کچھ جگنو اڑتے اور چمکتے نظر آتے ہیں۔ ایسی ہدایت اور رہنمائی جس سے انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلے منزل کی راہ پائیں اور تہذیب و تمدن کے ڈوبتے ہوئے سفینے کنارے لگ جائیں، صرف پیغمبروں ہی کے یہاں نظر آتی ہے۔

آج بھی دنیا میں جو اخلاقی حقیقتیں زندہ موجود ہیں، انسانوں کے پاس بدی سے لڑنے، نفس پر قابو پانے اور گناہ سے بچنے کی جو اندرونی طاقت، نیک و بد ظلم و عدل اور حق و باطل میں امتیاز کرنے کا جو ملکہ، اور انسانوں کی بے لوث خدمت کرنے کا جو سچا جذبہ پایا جاتا ہے وہ انہی پیغمبروں کی قربانی و جدوجہد کا نتیجہ ہے، جنھوں نے ناموافق ترین حالات میں خدا کے احکام کو پہونچایا اور بارہا انسانیت اور انسانی تہذیب و تمدن کو ہمیشہ کی تباہی اور ہلاکت سے بچایا۔ اور انسانیت کو نئی زندگی بخشی، حیوانیت پر انسانیت کی دوبارہ فتح کے لیے انکی تعلیمات سے بہتر تعلیمات، اور انکی نظیر سے زیادہ شاندار نظیر نہیں مل سکتی۔ آج جبکہ انسانیت کو پھر یہ معرکہ درپیش ہے اس سے زیادہ کوئی مفید کام نہیں کہ انکی سیرت اور تعلیمات کو دوبارہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اور اس پر خود چلنے کی کوشش اور دوسروں کو چلانے کی جدوجہد کی جائے۔

ان پیغمبروں میں (اللہ تعالےٰ کا درود و سلام ہو ان پر) کامیابی سب سے زیادہ جس کے نصیب میں آئی، اور جغرافیائی و تاریخی وسعت کے لحاظ سے انسانیت اور تہذیب و تمدن کے سب سے بڑے رقبے کی رہنمائی جس کے سپرد فرمائی گئی وہ بلاشبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ گروہ انبیاء میں سے

صرف آپ ہی کی سیرت اور زندگی اس وقت محفوظ، اور دنیا کی رہنمائی اور دستگیری کے لیے ہر جگہ موجود ہے۔ یہ انسانیت کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، اس میں پیغمبروں کی سیرتوں کا عطر، آسمانی تعلیمات وہدایت کا جوہر، اور اخلاق وروحانی طاقت کا سب سے بڑا خزانہ پوشیدہ ہے، اس کو پڑھ کر خدا کی ہستی اور اس کی مدد کا یقین پیدا ہوتا ہے، ناساز ترین ماحول اور حالات میں بدی اور ظلم کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ اُبھرتا ہے، اور انسانیت کو اپنے وجود پر بجائے شرم کے فخر محسوس ہوتا ہے، اور اگر مذہبی تعصب اور قومی تکبر آڑے نہ آئے، تو ساری دنیا اس سے نئی زندگی، نیا یقین، نئی روحانی لذت، نیا عزم وحوصلہ، اور از سرِ نو نجات کا راستہ حاصل کر سکتی ہے۔ اسلئے اسکی اشاعت سے زیادہ کوئی مفید کام نہیں۔

سیرت محمدیؐ کے موضوع پر دنیا کی مختلف زبانوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا شمار کرنا مشکل ہے، سیرت کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو، اُردو زبان اس باب میں امتیاز خاص رکھتی ہے کہ سیرت کی بعض مستند ووسیع ترین اور مؤثر ترین کتابیں اس میں لکھی گئیں، اور دوسری اسلامی زبانوں میں انکے ترجمے ہوئے۔

زبان وادب اور خود انسانی ذہن تغیر پذیر ہے، تمدنی وسیاسی انقلابات وتغیرات نئے نئے مسائل وسوالات پیدا کرتے رہتے ہیں ———— کچھ مدت پیشتر جن سوالات ومسائل کی بڑی اہمیت تھی اور سیرت نگاروں نے ان کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، آج ان میں وہ اہمیت وجاذبیت نہیں ہے، اور دنیا کا ذہن انکے جواب وتشریح کا مطالبہ نہیں کرتا، آج کچھ نئے مسائل وسوالات پیدا ہو گئے ہیں جن کی طرف توجہ کرنا اور یہ دکھانا کہ سیرت محمدیؐ اس باب میں کیا رہنمائی کرتی ہے، سیرت نگار کیلئے

ضروری ہے، پھر یہ زمانہ سرعت و عجلت کا ہے، سیرت کی ضخیم کتابوں کا پڑھنا اس زمانہ کے مصروف و تیز رو انسانوں کے لیے دشوار ہوگیا ہے، ان تمام حالات کا تقاضا تھا کہ سیرت پر ایک مفصل و ضخیم تصنیف کے بجائے تعلیمیافتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لیے سیرت کے مختلف پہلوؤں پر سنجیدہ و شگفتہ انداز میں لکھا جائے اور سیرت محمدی کا خلاصہ و عطر پیش کر دیا جائے اور دنیا کو یہ بتایا جائے کہ بیسویں صدی کی دُنیا کے لیے اسکے پاس کیا پیغام ہے اور انسانی زندگی کی تشکیل اور سیرت و کردار کی تعمیر میں کیا محل و مقام ہے، اس اہم کام کے لیے ایک ایسے صاحب علم کی ضرورت تھی جو سیرت کے مطبوعہ ذخیرہ کا صبر و ہمت سے جائزہ لے، جس کا عقیدت مند دل اور ہوش مند دماغ اس کے انتخاب و تلخیص میں پورا تعاون کریں، وہ نئے ذہن، نئے طرز فکر اور نئے طرز تحریر سے پورے طور پر واقف ہو، اور وہ اپنے مطالعہ و فکر کا نتیجہ ایسے مضامین کی شکل میں پیش کر دے جن میں علم کی سنجیدگی، ادب کی شگفتگی، مطالعہ کی وسعت، دلائل کا وزن، محبت کی چاشنی، پہلو بہ پہلو ہوں، کہ جس حیات طیبہ اور اسوۂ کاملہ سے ان کو نسبت ہے ان سے دل و دماغ دونوں اپنی مراد پاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے ڈاکٹر محمد آصف کا انتخاب فرمایا، ڈاکٹر محمد آصف کا تعلق بارہ بنکی کے اس نامور قدوائی خاندان سے ہے جو اپنی دماغی و عملی صلاحیتوں کے لیے صرف اودھ ہی میں نہیں سارے ہندوستان میں مشہور ہے، ان کی پرورش بھیارہ (ضلع بارہ بنکی) کے ایک زمیندار

خاندان میں ہوئی جو دُنیاوی وجاہت وثروت کے ساتھ علم وادب کا بھی ذوق رکھتا تھا اور اپنی وضعداری اور خاندانی روایات کی بنا پر اپنے جوار میں خاص وقار وامتیاز کا مالک ہو۔ محمد آصف صاحب ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے ۱۹۴۲ء میں ۲۳ سال کی عمر میں ایم۔اے کیا۔ پھر ۱۹۴۷ء میں سیاست میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی، ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ لندن کے مشہور فاضل ومحقق پروفیسر لاسکی کو جانچنے کے لیے بھیجا گیا، انھوں نے پرزور الفاظ میں اس کی تعریف اور صاحبِ مقالہ کے لیے ڈاکٹریٹ کی سفارش کی۔

اگر حالات اپنی طبعی رفتار سے چلتے رہتے تو معلوم نہیں ہمارے عزیز فاضل دوست محمد آصف صاحب آج کس علمی اعزاز اور مادی امتیاز پر فائز ہوتے اور ان کا کیا مشغلہ ہوتا، لیکن قدرت کے کاروبار عجیب ہیں، اور خدا کی حکمت کو کوئی نہیں جانتا، ان کے لیے ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ وہ دُنیا کے تمام کاموں سے یکسو ہو کر علم ومطالعہ اور اس راہ سے خدمتِ دین کے لیے وقف ہو جائیں۔ جس مربی حکیم نے امام ابن تیمیہ کو دمشق کے قلعہ میں بٹھا کر انقطاع عن الخلق کی دولت اور اہم تصانیف کی توفیق عطا فرمائی اور جس نے اس دورِ آخر میں بیسویں صدی کے مردِ مومن محمد علیؒ کو چھندواڑہ کے حدود میں مقید کر کے قرآنِ مجید کے حفظ وفہم کی دولتِ جاوید عطا فرمائی وہ اگر کسی بندہ کو کسی جگہ بٹھا کر یا آرام سے لٹا کر اور تمام دنیا کے مقاصد ومشاغل سے یکسو بنا کر اپنے دین کی خدمت لیتا ہے اور اپنے رسول پاک کی سیرت نگاری کی توفیق دیتا ہے تو اس میں

تعجب کی کیا بات ہے۔

محمد آصف صاحب کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اردو اور انگریزی دونوں میں ان کا مطالعہ تازہ اور up to date ہو، ادب، تاریخ اور سیاست، ان کا خاص موضوع ہے، اور اب دینیات و تصوف سے بھی ذوق اور ان کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا ہے، انگریزی کے صاحب طرز انشا پردازوں کی نثر کا انھوں نے وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہو، انگریزی نثر و انشاء کے مطالعہ نے ان کی اردو تحریر میں انگریزی انشا پردازی اور نثر جدید کی خصوصیات پیدا کر دی ہیں، اپنے موضوع کی پابندی، حشو و زوائد سے احتراز، اختصار کے ساتھ قوت و تاثیر ان کی تحریر کا جوہر ہے، ان کا سارا نشو و نما لکھنؤ میں ہوا ہے اور علم و ادب کی محفلوں اور ماحول میں ان کی عمر گزری ہے وہ شروع سے اردو میں لکھتے رہے اس لیے ان کے قلم میں پختگی اور شگفتگی دونوں موجود ہیں۔

محمد آصف صاحب نے جب اس کام کا بیڑہ اٹھایا تو اردو اور انگریزی کے سارے ذخیرے کو جو سیرت کے متعلق تھا، کھنگالا، انھوں نے جس طرح اردو میں سیرت کی مستند اور ضخیم کتابیں پڑھیں، اسی طرح سیرت پر انگریزی مصنفین نے موافقانہ و مخالفانہ جو کچھ لکھا ہے اس کا بھی جائزہ لیا، انھوں نے اپنے قلم کو صرف زندگی اور حیات طیبہ پر لکھنے کا پابند نہیں کیا، بلکہ ان تمام مسائل و حقائق کو پیش نظر رکھا جو ایک کامل زندگی اور کامل تعلیم کی رہنمائی کی طالب ہیں، ان کا موضوع سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور حیات طیبہ بھی ہو۔ آپ کا پیغام اور آپ کی پیش کی ہوئی تعلیم بھی، وہ موقع بموقع یہ بھی دکھاتے

چلتے ہیں کہ یہ تعلیم اس نئی نسل اور اس نئے دور کی کیا رہنمائی اور دستگیری کرتی ہو اور نئی تہذیب اس سے بے نیاز ہو کر یا اس سے انکار کر کے کن کن مصائب میں مبتلا ہو ان کے مضامین کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہو کہ وہ اپنے ماحول اور زمانہ سے غیر متعلق اور ناآشنا نہیں ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا ان مضامین کو کسی الگ تھلگ مقام پر زندگی اور اس کے مسائل سے آنکھیں بند کر کے نہیں لکھ رہا ہو بلکہ اسی پُرشور و رواں دواں زندگی میں ہے اور خود بھی قلب حساس دیدۂ بینا، گوش شنوا رکھتا ہو، وہ نئے واقعات اور تجربات سے فائدہ اٹھاتا ہو اور ان کے صحیح نتائج نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔

بعض موضوع ایسے ہیں جن پر اس سے پیشتر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، ان میں بظاہر کوئی نئی بات کہنی مشکل ہے، مثلاً یہ بات کہ "اسلام بزور شمشیر پھیلا" اس پر سر سید احمد خاں اور مولانا شبلی کے وقت سے ہمارے اس دور تک بہت کچھ اور بہت خوب لکھا جا چکا ہے، پھر بھی آصف صاحب نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے، اور اس موضوع پر ایک اضافہ ہے۔ اسی طرح "دورِ جاہلیت" سیرت کی ہر کتاب کا ایک لازمی باب اور ضروری مضمون ہو لیکن آصف صاحب نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے وہ پر مغز اور پُراز معلومات ہو، چونکہ انگریزی ماخذوں پر اور عہد جاہلی کی معاصر تاریخوں پر ان کی اچھی نظر ہو اسلئے اس سلسلہ میں انھوں نے قیمتی اور منتخب مواد پیش کر دیا ہے جس سے عہد جاہلیت کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

ساری کتاب شستہ و شگفتہ زبان میں لکھی گئی ہے، کہیں اُلجھاؤ تصنع اور

لفاظی نہیں معلوم ہوتی، طرز بیان سادہ لیکن مؤثر ہو، بعض حصے تو سادگی و سلاست کے باوجود اچھی خاصی ادبیت کے حامل ہیں، یہ مضامین اپنے مواد و معلومات، استدلال و مطالعہ، طرز تحریر و تاثیر، اور لکھنے والے کے خلوص و حسن نیت، ہر اعتبار سے پڑھے جانے اور اشاعت پانے کے مستحق ہیں، اور ان کے ذریعہ سیرت محمدی کا خلاصہ اور اس کے اہم پہلو اور گوشے اور اس کا پیغام سامنے آجاتا ہے، اور دور جدید کے لیے اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا۔

"مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" جس کا مقصد ہی تعلیمیافتہ مسلمانوں اور غیر مسلم اصحاب کے لیے سنجیدہ و پُرمغز، صالح و مؤثر، خیال افروز و یقین آفریں اسلامی لٹریچر کا تیار کرنا اور پہونچانا ہے بڑی مسرت اور شکر کے ساتھ اس کتاب "مقالات سیرت" سے اپنی مطبوعات و سلسلۂ اشاعت کا آغاز کرتی ہو۔ امید ہو کہ وہ بہت جلد دوسرے مفید عنوانات و مضامین پر جن کا ہماری موجودہ زندگی اور اسکے مسائل سے گہرا تعلق ہو مفید اور وقیع کتابیں پیش کرے گی۔

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہ

ابوالحسن علی

لکھنؤ، ۶ محرم الحرام ۷۹ھ

پہلا مقالہ

اسلام میں نبوّت کا تصوّر

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ

"(اے محمد) کہہ دو کہ میں تمھاری ہی طرح ایک بشر ہوں، (فرق صرف یہ ہو کہ) مجھ پر وحی کی جاتی ہے ——"

—————— (القرآن: حم السجدہ)

دُنیا کو وجود میں لانے کے بعد اس کی ہدایت ضروری تھی، اس کے لیے خدا نے اپنے پاکیزہ اور مقبول بندے بھیجے، ان سچّے اور اچھے لوگوں کو پیغمبر یا نبی یا رسول کہتے ہیں۔ خدا ان کو تعلیم دیتا تھا اور یہ خدا کی تعلیم دوسرے انسانوں تک پہونچاتے تھے۔

آج دُنیا میں نیکی اور پاکیزگی کی جو بھی شعاعیں پائی جاتی ہیں وہ ان ہی انبیائے عظام کی عطا کی ہوئی ہیں۔ خدا کی عظمت کا احساس، اچھے بُرے کی تمیز، عدل و انصاف کی قدر، حتیٰ کہ آزاد خیال، بے دین اور ملحد لوگوں کی نکوکاری کا بھی بلا واسطہ یا بالواسطہ ان ہی کی برکتوں کا پرتو ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسے محسوس نہ کیا جائے یا اس کا اعتراف نہ کیا جائے۔

تمام انبیاء اپنے عہد کے بہترین انسان تھے، خدا ان سے راضی تھا، وہ خدا سے راضی تھے، اور اگرچہ بشریت میں وہ عام انسانوں ہی کی طرح تھے، مگر باطن اور معنویت میں بہت بلند تھے، امام غزالی نے نبوت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے، معراج القدس میں لکھا ہے کہ "نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے"۔ امام موصوف علیہ الرحمہ نے یہ بھی بتایا ہو کہ نبوت "عطیہ الٰہی اور موہبت ربانی ہے (اور) سعی و محنت و کسب و تلاش سے نہیں ملتی"۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

اَللّٰہُ یَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسٰلَتَہٗ (القرآن ۔ الانعام)	"اللہ بہتر جانتا ہو کہ کہاں وہ اپنی پیامبری کا منصب بنائے۔
ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ (القرآن : جمعہ)	"یہ (نبوت) خدا کا فضل ہے وہ جس کو چاہے دے"۔

نبی کا مقام مصلح اور مفکر کے مقاموں سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے، تمام انبیاء پاکیزہ اور معصوم، گناہوں سے دور اور خطاؤں سے محفوظ تھے، ان کے سپرد گنہگاروں کی رہنمائی تھی۔ اگر وہ خود بھی گنہگار ہو سکتے تو اس سعادت کے مستحق کیسے ہوتے؟ جو خود اندھیرے میں ہو وہ دوسروں کو بھلا کیا روشنی دے سکتا ہے؟ اسکے برعکس اگر کسی مصلح یا مفکر کے دامن پر معصیت کے دھبے بھی ہوں تب بھی اس کے منصب میں کوئی فرق نہیں آتا، مثلاً ایک جید فلاسفر اور حریت کے علمبردار کی حیثیت سے سقراط کی تعظیم ہمیشہ ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اگرچہ اس کی جنسی زندگی بہت مکروہ تھی۔

قرآن مجید میں بلا تفریق تمام انبیاء کی عصمت کا اعلان کیا گیا ہے۔ اور ان تمام

شرمناک باتوں کو قلمزد کیا گیا ہے جو توریت، انجیل اور اکثر دوسری کتابوں میں ان معصوموں سے منسوب کی گئی ہیں۔

وَكُلًّا جَعَلْنَا صَالِحِينَ — "اُن میں سے ہر ایک کو ہم نے
(القرآن: انبیاء) — صالح بنایا۔"

كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ۔ (انعام) — "یہ سب صالحوں میں تھے۔"

وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ — "اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا
إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ (ایضاً) — اور سیدھی راہ پر چلایا۔"

دوسرا فرق یہ ہے کہ مصلحوں اور مفکروں کے برخلاف انبیاءؑ اپنے تمام افعال میں ہدایت ربانی کے تابع ہوتے تھے۔ نہ خود ان کی کوئی مرضی تھی نہ ارادہ۔ وہ وہی کہتے اور کرتے تھے جس کا انھیں خدا کی طرف سے حکم دیا جاتا تھا۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ — "اور وہ اپنی خواہش نفسانی سے
إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ — کلام نہیں کرتا بلکہ وہی کہتا ہے جو اسکے
(القرآن: نجم) — خدا کی " سے کہا جاتا ہے۔"

خدا اور انبیاء کے درمیان پیام رسانی اور سفارت کا کام عموماً فرشتوں کی وساطت سے ہوتا تھا۔ خدا کے یہ فرمانبردار قاصد ایک اطاعت شعار اور بے اختیار محکوم کی طرح خدا کے احکام اس کے پیغمبروں تک پہونچاتے تھے۔

بِأَيْدِي سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ — "ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں جو
(القرآن: عبس) — مکرم اور برگزیدہ ہیں۔"

لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ — اللہ جو ان کو حکم دیتا ہے وہ اس میں

وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۔ (تحریم) — نافرمانی نہیں کر سکتے اور وہی کرتے ہیں جس کا انھیں حکم دیا جاتا ہو۔

ان احکام کو وحی کہتے ہیں۔

'لسان العرب' میں وحی کے معنی حسب ذیل بتائے گئے ہیں۔ "اشارہ کرنا، لکھنا پیغام دینا، دل میں ڈالنا، چھپا کر بولنا، اور جو کچھ تم دوسرے کے خیال میں ڈالو" یعنی منھ سے لفظ نکالے بغیر ایک شخص کا دوسرے شخص کو اپنا مفہوم سمجھا دینا اور اگر الفاظ ہوں تو وہ اس قدر پوشیدہ ادا ہوں کہ کوئی دوسرا نہ سن سکے! لیکن دینی اصطلاح میں لفظ 'وحی' کا اطلاق صرف ان باتوں پر کیا جاتا ہے جو خدا اپنے پیغمبروں پر اتارا کرتا تھا۔

ان آسمانی ہدایتوں میں کوئی نبی اپنی طرف سے ردّ و بدل نہیں کر سکتا تھا۔

اور بفرض محال اگر کوئی نبی خدا کی طرف کبھی کسی ایسی بات کے منسوب کرنے کا ارادہ بھی کرتا جو اس کی طرف سے نہ ہوتی تو قبل اس کے کہ وہ اس پر عمل کر سکتا خدا اسکی زندگی ہی کا خاتمہ کر دیتا۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۙ	"اور اگر وہ کوئی جھوٹ اپنی طرف
لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۙ ثُمَّ	سے بنا کر کہتا تو ہم اس کا ہاتھ پکڑ لیتے
لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۖ	اور اسکی گردن کی شہ رگ کاٹ ڈالتے
فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ	پھر تم میں سے کوئی اسکو ہم سے
حٰجِزِيْنَ ۝ (القرآن: حاقہ)	بچا نہ سکتا۔"

دشمنوں کے شر اور فتنہ سے بھی خدا اپنے نبیوں کی حفاظت کرتا رہتا تھا، اور ہر حال میں انکی دستگیری فرماتا تھا، تاکہ شیاطین، خواہ وسوسوں کی شکل میں خواہ جن و انس کی صورت

میں انکو گمراہ نہ کر سکیں۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ۔ (القرآن: نساء)

"اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو ایک گروہ نے تجھے گمراہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، اور وہ گمراہ نہیں کریں گے لیکن خود اپنے کو، اور تجھے کچھ بھی نقصان نہ پہونچا سکیں گے۔

انبیاء کے سامنے نہ جاہ طلبی ہوتی تھی نہ حُبِّ مال، اپنی عدیم المثال خدمت کے معاوضے میں وہ عزت، شہرت، طاقت، حکومت، مال اور دولت کے بجائے لوگوں سے تقویٰ اور پرہیزگاری ہی مانگتے تھے۔ ان کا کام محض اللہ کے لیے تھا اور ان کا اجر بھی تمام تر اللہ ہی کے پاس تھا۔

يٰقَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي۔ (القرآن: ہود)

"میں اپنی نصیحت کی تم سے اجرت نہیں مانگتا، میرا اجر تو اس پر ہو جس نے مجھے پیدا کیا۔"

وَيٰقَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ۔ (ایضاً)

میں اپنی تبلیغ کے عوض میں تم سے مال و دولت کا خواہاں نہیں ہوں، میرا اجر تو بس خدا کے پاس ہو۔

سب سے بڑا فرق شخصیت اور منصب کی جامعیت کا ہے، مصلح کا فرض قوم میں ایک آدھ اصلاح جاری کر کے ختم ہو جاتا ہے، مفکر کا کام فکر کی انجمن میں نئی شمعیں روشن کرنا ہو اور بس۔ لیکن نبوت حیاتِ انسانی کے تمام گوشوں کی احاطہ گیر ہوتی ہے، یہ بات بھی دنیا نے

پیغمبر اسلام کی وساطت سے جانی۔ یہودیوں کے وہاں نبوت کے معنی پیش گوئی کے تھے۔ نبی وہ صرف اس کو کہتے تھے جس کی بابت اطلاع بالغیب کا عقیدہ رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اسکی دعائیں اور بد دعائیں اثر کر جاتی ہیں۔ اسی اصول کی بنا پر وہ اکثر جلیل القدر انبیاء کے مقابلہ میں کاہنوں کو زیادہ قابل احترام خیال کرتے تھے۔ انجیل میں بھی نبوت کی کوئی صاف اور واضح تصویر نہیں پائی جاتی ہے، ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ "مجھ سے پہلے جو آئے وہ چور اور ڈاکو تھے"[۵]

آنحضرت صلعم نے بتایا کہ انبیاء ہادی (رہنما) نذیر (ہشیار کرنے والے) داعی (خدا کی طرف بلانے والے) مبشّر (خوشخبری سنانے والے) معلّم (سکھانے والے) مبلّغ (خدا کے احکام پہونچانے والے) نور (روشنی) مبین (خدا کی صفات بیان کرنے والے) مزکّی (پاک وصاف کرنے والے) حاکم (فیصلہ کرنے والے) مطاع (واجب الاطاعت) آمر (حکم دینے والے) ناہی (منع کرنے والے) صاحبِ حکمت اور صاحبِ خلقِ عظیم تھے۔

اسلام سے پہلے ہر قوم اس وہم میں مبتلا تھی کہ وہی خدا کی محبوب اور مخصوص قوم تھی، اور صرف اسی کی سرزمین روحانی پیشواؤں کا مسکن بننے کے لائق تھی۔ باقی تمام قومیں فیوض ربانی سے محروم تھیں، ہندو آریہ ورت ہندوستان ہی کو دیوتاؤں کی جنم بھومی سمجھتے تھے زرتشت نے ایرانیوں کے سوا ساری دنیا کو راندۂ درگاہ ٹھہرا دیا تھا، بنی اسرائیل خود کو خدا کا کنبہ سمجھتے تھے اور دوسری اقوام میں انبیاء کا مبعوث ہونا ان کے خیال ہی میں نہ آتا تھا۔ یہی حال عیسائیوں کا تھا، لیکن پیغمبر اسلام نے آکر بتایا کہ رنگ و نسل اور زبان و

---

[۵] انجیل

وطن کی تفریقیں خدا کی نظر میں بے حقیقت ہیں. تمام قومیں اُسی کی خلق کی ہوئی ہیں، سب کی فلاح اسے یکساں عزیز ہے، اس نے اپنے پیغمبر دُنیا کے ہر گوشے میں بھیجے ہیں، اور کوئی قوم نورِ ہدایت سے محروم نہیں رہی ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ (القرآن: یونس)	"اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہوا ہے"
وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ	"اور ہم نے یقیناً ہر قوم میں ایک
رَّسُولًا (نحل)	رسول بھیجا"
وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا	"اور کوئی قوم نہیں جس میں ایک
نَذِيرٌ۔ (فاطر)	ہشیار کرنے والا نہ آیا ہو"
وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا	"اور ہم نے ہر پیغمبر کو اسکی قوم کی بولی
بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ۔	میں بھیجا تاکہ وہ ان کو بتا سکے"

یہ سلسلۂ نبوت پہلے انسان یعنی حضرت آدم علیہ السّلام سے شروع ہو کر آخری پیغمبر یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا، نبیوں کی مجموعی تعداد کا تعین مشکل ہے۔ قرآن میں بہت سے نبیوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے، مگر یہ فہرست محض نمونہ کے طور پر ہے، اور اس میں وہی نام گنائے گئے ہیں جن سے اہلِ عرب یا ان کی ہمسایہ قومیں، یہود اور نصاریٰ پہلے سے واقف تھے۔ بعض مسلمان مصنفین نے پیغمبروں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی ہے[1] اور بعض نے اس سے کم۔ لیکن اس بارہ میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا احتیاط کے خلاف ہے، اسی طرح مختلف قوموں کی ان باعظمت ہستیوں کے نبی ہونے یا نہ ہونے

---

[1] طبرانی

کی بابت بھی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے، جن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے، مگر اُنکے نبی ہونے کا امکان ضرور ہے۔

ہم پر تمام انبیاء کا احترام فرض ہے، لیکن بدقسمتی سے اکثر مذاہب اس سلسلہ میں اپنے پیرووں کی تنگ نظری کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہودیوں پر حضرت موسیٰ کے علاوہ کسی اور نبی کا اقرار ضروری نہیں رہا ہے۔ ہندو تمام غیر ہندو انسانوں کو ملچھ اور چنڈال سمجھ کر بھی بہترین ہندو رہ سکتے ہیں۔ مسیحی حلقوں میں تو گویا پیغمبر اسلام کی تحقیر ہی بڑائی کی پہچان بن گئی ہو۔ غرضکہ، عام طور پر، ایک مذہب کے ماننے والے اپنے دائرہ کے باہر کے کسی نبی کی عزت و توقیر ضروری نہیں سمجھتے ہیں، لیکن مسلمان ایسا نہیں کر سکتے ان پر تمام انبیاء کی تعظیم ویسے ہی واجب ہے جیسے کہ خود اپنے نبی کی تعظیم، اور یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کچھ کو مانیں اور کچھ کو نہ مانیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ
بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيدُونَ
أَنْ يُّفَرِّقُوا بَيْنَ اللّٰهِ وَ
رُسُلِهٖ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ
بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيدُونَ
أَنْ يَّتَّخِذُوا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا
أُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ حَقًّا

"بیشک جو لوگ اللہ اور اسکے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اسکے رسولوں میں فرق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہیں مانیں گے، اور چاہتے ہیں کہ اسکے بیچ بیچ کوئی راستہ نکالیں۔ وہی تو حقیقت میں کافر ہیں۔

(القرآن: نساء)

بقول علامہ سید سلیمان ندوی "کوئی شخص اس وقت تک محمدی نہیں ہو سکتا جب تک وہ

موسوی، عیسوی .... نہ بن لے۔ اور کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا کے تمام پیغمبروں کی یکساں صداقت، حقانیت، راست بازی اور معصومیت کا اقرار نہ کرے۔ اور یہ یقین نہ کرے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کی طرح ہر قوم کو اپنی ہدایت اور رہنمائی سے سرفراز کیا ہے۔ اور ان کا ماننا ایسا ہی ضروری ہو جیسا کہ خدا کا ماننا۔[لہ]

(۲)

اپنے سارے فضائل و اوصاف کے باوجود انبیاء انسان ہی تھے۔ وہ خدا یا خدا کے بیٹے، یا خدا کے اوتار نہ تھے۔ دراصل انبیاء میں الوہیت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی تسلیم کر لینے کے بعد توحید اور نبوت کی حیثیتیں ہی مشتبہ نہیں ہو جاتی ہیں، اور خدا کی یکتائی کا تصور ہی مجروح نہیں ہو جاتا ہے، بلکہ انبیاء کی بعثت کا مقصد ہی ختم ہو جاتا ہے، اور ان کی زندگیاں ہمارے لیے کچھ زیادہ مفید نہیں رہتیں۔

مثلاً حضرت عیسیٰ کی سیرت کتنی پاکیزہ نظر آتی ہے، انکی معصومیت اور بے نفسی ان کے عفو اور درگزر، صبر و توکل اور حلم اور بردباری کا ہمارے اوپر کتنا اچھا اثر پڑ سکتا ہے، لیکن الوہیت کا رنگ دینے کے بعد ان کا حسن ضائع ہو جاتا ہے۔

اگر اناجیل ہی کے بیان کو معیار قرار دیا جائے تو الوہیت کے معیار پر حضرت عیسیٰ کی زندگی عجیب حسرت ناک منظر پیش کرتی ہے۔ خدا اور بندوں کے آگے بے بس ہو، اس پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹیں۔ اس کی توہین ہو اور وہ عاجزی اور لاچاری کا مرقع بنا ہے!

لہ سیرۃ النبی، چہارم جلد، صفحہ ۵۸۹

حد یہ ہے کہ خدا ماننے کے بعد ان کے حیرت انگیز معجزے بھی بے حقیقت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ کیونکہ ان خوارق کی قدر و قیمت صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک کہ انکو بہ تائید غیبی ایک برگزیدہ انسان ہی کی برکات و کرامات سمجھا جائے ورنہ قدرت خداوندی کی ان سے کہیں زیادہ عجیب و غریب باتیں تو دن رات نظر آتی رہتی ہیں۔

حضرت عیسیٰ کے صحیفۂ حیات میں کوئی بات بھی تو نہیں ملتی جو اہلِ کلیسا کے اس دعوے کی تصدیق کر سکے کہ وقتِ مقررہ پر خدائے قادر و توانا گوشت اور خون کا لباس پہن کر ان کی ہیئت میں ظاہر ہوا تھا۔ عیسائی مبلّغین اس سلسلہ میں اکثر ان کے معجزات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن صدورِ خوارق حضرت عیسیٰ ہی کا طرۂ امتیاز نہ تھا۔ تمام انبیاء اس سے ممتاز ہوئے ہیں۔ اور انجیل میں بھی دوسرے پیغمبروں کی بابت ایسی ہی باتیں بیان کی گئی ہیں کہ وہ مُردوں کو زندہ اور لاعلاج مریضوں کو تندرست کر دیتے تھے۔ اور انکی ضرب سے سمندر پھٹ جاتا تھا، وغیرہ وغیرہ تو کیا ان سب کو عیسائی حضرات خدا یا خدا کے بیٹے یا خدا کے اوتار ماننے پر تیار ہیں؟

علاوہ ازیں، کسی نبی کو خدا یا خدا کے اوتار کا مقام دینے کے بعد اسکی زندگی ہمارے لئے نمونہ اور مثال کے کام کی نہیں رہتی، کیونکہ ہم بہرحال اسی کی اقتدا کر سکتے ہیں جو قوت و اختیار کے معاملہ میں ہمارے ہی جیسا ہو، یا دوسرے لفظوں میں ہم اُسی کے نقشِ قدم کو خضرِ راہ بنا سکتے ہیں جس کے قدم ہم سے مختلف نہ ہوں، مختلف الجنس مخلوق ہم کو مرعوب تو کر سکتی ہو مگر رہنمائی اور رہبری نہیں کر سکتی اور نہ وہ ہمارا آئیڈیل بن سکتی ہے۔ مثلاً شیر یا ہاتھی ہم کو سہما سکتے ہیں، خوف زدہ کر سکتے ہیں اور کبھی کبھی پسندیدگی اور رشک کے جذبات بھی پیدا کر سکتے ہیں لیکن ہم انکو اپنا ہیرو

بنانے سے معذور ہیں کیونکہ ہم لاکھ چاہیں شیر یا ہاتھی بننا ہمارے امکان میں نہیں ہے۔ [۵]

آیڈیل یا ہیرو کا تعین کسی ایک ذات میں وہ تمام اچھائیاں جمع کر کے جو مختلف افراد میں نظر آتی ہیں اور اس میں سے تمام برائیاں خارج کر کے کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے ہم جنسوں میں نمونہ اور مثال کا کام دے سکے۔ اوتاروں میں چونکہ ایسی طاقتیں یقین کیجاتی ہیں جن پر دوسرے انسانوں کو قدرت نہیں ہوتی اسلیئے انھیں منتہائے انسانیت یا انسانوں کے آیڈیل یا ہیرو بنا لینا درست نہیں ہو سکتا ہے۔ انسان عملاً اپنی زندگی ان کے نمونہ پر ڈھالنے سے ہمیشہ معذور رہے گا۔

انبیاء انسانوں میں مبعوث ہوتے تھے اور ان کے سپرد انسانوں کی رہنمائی اور ہدایت ہوتی تھی، انکی دعوت کی کامیابی کے لیے یہ لازمی تھا کہ وہ تمام تر بشر ہی ہوتے اور زندگی کے نشیب و فراز سے گذرنے کے لیے اور مختلف دشواریوں کو عبور کرنے کے لیے وہ وہی تدبیریں اور وسیلے استعمال کرتے جو نوعِ انسانی کا خاصہ ہیں۔

خدا کے رسولوں کی بڑائی کا انحصار ان کے کائنات پر متصرف ہونے اور طرح طرح کے معجزے دکھانے پر نہیں بلکہ لوگوں میں حق اور غیر حق کی تمیز پیدا کر کے ان کی روحانی اور اخلاقی سطحوں کو بلند کرنے میں ہے۔ معجزات سے معارض کو لاجواب اور خاموش کیا جا سکتا ہو۔ لاجواب اور خاموش کر کے ہم دشمنوں کو زیر تو کر سکتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں تسکین و تشفی پیدا کرنے کا یہ طریقہ

---

[۵] خواجہ کمال الدین "آیڈیل پرافٹ" (The Ideal Prophet)

نہیں ہے۔ تسکین اور تشفی کے لیے اتحادِ جنسیت ضروری ہے۔ یہی چیز دلوں کو کھینچتی ہے، اضطراری اور عارضی طور پر نہیں، بلکہ عادتاً اور مستقلاً، اور ان میں نیکی اور سچائی کے عناصر پیدا کرتی ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

موجبِ ایماں نباشد معجزات
بوئے جنسیت کند جذبِ صفات
معجزات از بہرِ قہرِ دشمن است
بوئے جنسیت سوئے دل بُردن است
قہر گردد دشمن اما دوست نے
دوست کے گردد بہ بستہ گردنے

اسلام سے پہلے انبیاء کو غیر از بشر سمجھنے کا عام دستور تھا۔ انکی بابت انسانوں کے بجائے انسانوں کے بھیس میں خدا یا فرشتہ ہونے کا عقیدہ رکھا جاتا تھا، اور یہی غلط تصور لوگوں کو ان پر ایمان لانے سے روکتا تھا۔ قرآن مجید نے اس کی نفی کی۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا	ہدایت آجانے کے بعد لوگوں
اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓی اِلَّآ	کو اسکے قبول کرنے سے اس کے
اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ	علاوہ کوئی امر مانع نہیں ہے کہ
بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ کَانَ	وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ایک بشر کو
فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِکَةٌ یَّمْشُوْنَ	اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔" کہدو
مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ	کہ اگر زمین پر فرشتے بستے ہوتے

مِنَ السَّمَآءِ مَلَکًا رَّسُوۡلًا ۝ تو البتہ ہم کسی فرشتے ہی کو انکے
(القرآن: بنی اسرائیل) پاس رسول بنا کر بھیجتے "

یعنی رہبری اور قیادت کے لیے اشتراکِ جنسیت ضروری تھا چنانچہ تمام انبیاء اپنے تمام جسمانی خصائص، یعنی جینے، مرنے، بیمار پڑنے اور صحت یاب ہونے کھانے، پینے، اٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے، صورت شکل، ہاتھ پاؤں، وغیرہ کے اعتبار سے خالص بشر ہی تھے۔

وَمَا جَعَلۡنٰهُمۡ جَسَدًا لَّا یَاۡکُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَمَا کَانُوۡا خٰلِدِیۡنَ ۝ (القرآن: الانبیاء) "ہم نے ان کا جسم ایسا نہ بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھائیں، اور وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے بھی نہ تھے"

وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰی ۝ (القرآن: یوسف) "اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے تھے وہ بشر ہی تھے آبادیوں کے رہنے والے ہم ان پر وحی کرتے تھے۔

یہ ہدایت دراصل نئی نہ تھی، لیکن نبوت کا مافوق الفطرت تصوّر اتنا قوی تھا کہ ہر نبی کو اسکا ازسرِ نو سامنا کرنا پڑتا تھا۔ حضرت نوح علیہ السّلام پر بھی انکی قوم کی جرح یہی تھی کہ:۔

مَا نَرٰکَ اِلَّا بَشَرًا مِّثۡلَنَا (القرآن: ہود) "ہم تو تجھے اپنے ہی جیسا بشر دیکھتے ہیں"

اور جواب میں انھوں نے یہی فرمایا تھا کہ:۔

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّیْ مَلَكٌ (ایضاً)

"میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے قبضہ میں خدا کے خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے بھی صاف کہہ دیا تھا کہ:-

اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا۔ (القرآن: مریم)

"میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا۔"

پھر بھی جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت کیا تو ان کی قوم تعجب سے پکار اٹھی کہ:-

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (القرآن: بنی اسرائیل)

"خدا نے (تو) انسان کو پیغمبر بنا کے بھیجا ہے۔"

اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا۔ (تغابن)

"کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے"؟

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ مَلَكٌ فَیَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِیْرًا اَوْ یُلْقٰٓى اِلَیْهِ كَنْزٌ ...... (فرقان)

"اور لوگوں نے کہا کہ یہ پیغمبر کیوں کھاتا ہے اور کیوں بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، کیوں اس پر ایک فرشتہ نہیں اترتا جو اس کے ساتھ لوگوں کو ڈرانے والا ہو، یا اس پاس خزانہ کیوں نہیں اتارا جاتا......"

اس کج ذہنی کے پیش نظر آنحضرت صلعم نے عبدیت کو اپنے اوپر اس قدر غالب کر لیا اور انبیاء کی بشریت کا اعادہ آپ نے اس صفائی اور شدت سے کیا کہ کل مسئلہ ہمیشہ کے لیے روشنی میں آگیا اور کم از کم مسلمانوں کے لیے نبوت اور الوہیت کے مفہوموں میں غلطی کرنے کا امکان باقی نہ رہا۔ قرآن کی یہ آیات ملاحظہ ہوں:-

هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (القرآن: بنی اسرائیل)

"میں تو ایک انسان پیغمبر ہوں"

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (کہف)

"کہدے کہ میں تمھاری طرح ایک بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے"

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (ایضاً)

"محمد تو صرف ایک رسول ہیں اور ان سے پہلے کئی ایک رسول گذر چکے ہیں"

دنیا کی تمام چیزوں پر انبیاء کو براہ راست قادر سمجھا جاتا تھا، غیب کا علم، نفع ونقصان پر اختیار، مارنے اور جلانے پر قدرت، ہوا میں اُڑنا، خدا سے رو در رو باتیں کرنا، غرض تمام عجیب وغریب باتیں اُن سے منسوب کی جاتی تھیں، اسلام نے ان اوہام وخرافات کی بھی بیخ کنی کی۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (القرآن: انعام)

"اے پیغمبر کہدو کہ میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں، اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں، اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ

ہوں، میں تو اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔"

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ.

(اعراف)

"اے پیغمبر ان لوگوں سے کہدے کہ خود میرا نفع ونقصان میرے قبضۂ اختیار میں نہیں، لیکن جو خدا چاہے اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا تو خود اپنا بہت سا نفع کرلیتا، اور نہ مجھ کو کوئی گزند پہونچتا۔"

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا......

(القرآن: شوریٰ)

"کسی بشر کے لیے ممکن نہیں کہ خدا اس سے رو در رو باتیں کرے۔ الا یہ کہ وحی کے ذریعہ اپنا پیغام پہونچائے...... الخ

اقرار عبدیت کا یہ بھی کتنا اچھا اسلوب تھا جس کے اختیار کرنے کا رسول کو حکم ملا۔

إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ

(القرآن: انعام)

"میری نماز، میری قربانی، میری زندگی میری موت اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام عالم کا پالنے والا ہے، اس کا کوئی بھی شریک نہیں ہے، مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں سب سے پہلے اس کے حکم برداروں میں ہوں۔"

یا یہ کہ اے خدا میں بندہ ہوں تیرا۔ اور بیٹا ہوں تیرے بندہ کا، اور بیٹا ہوں

تیری بندگی کا ہمہ تن تیرے قبضہ میں ہوں، نافذ ہے میرے بارہ میں تیرا حکم، عین عدل ہے میرے باب میں یہ فیصلہ.......![1]"

پیغمبروں کو خدائی یا نیم خدائی کا مرتبہ دینے کی بڑی حد تک ذمہ داری مقدس ہستیوں کی اعتدال سے بڑھی ہوئی تقدیس و تکریم پر ہے۔ معتقدوں کی غلو آمیز جوش عقیدت اکثر اوقات دینی رہنماؤں کو معبود و مسجود کے مقام تک پہونچا دیتی ہے۔ پیغمبر اسلام نے اس خطرہ کا ساری عمر لحاظ رکھا، اور کبھی اپنی بے جا تعظیم کی اجازت نہ دی۔

آپ سے یہودیوں نے ایک بار دریافت کیا کہ "کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کیا کریں۔ جس طرح عیسائی حضرت عیسیٰ کی عبادت کرتے ہیں؟" ارشاد ہوا۔۔۔۔
"معاذ اللہ! میں اور غیر اللہ کی عبادت کا حکم دوں![2]"

یہ آیات قرآنی اسی وقت نازل ہوئی تھیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ	"جس بشر کو خدا کتاب اور حکم اور
اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ	نبوت عطا کرے اس سے نہیں ہو سکتا
ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا	کہ پھر وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کے سوا
لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا	میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ (اس کی ہدایت
رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ	دعوت یہی ہوتی ہے کہ ہو جاؤ سب
الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ	اللہ والے، مطابق اس کے کہ پڑھتے پڑھاتے
وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ	ہو اللہ کی کتاب کو، وہ ہرگز یہ نہیں کہتا

---

[1] طبرانی [2] رحمۃ للعالمین، جلد اوّل، ص ۲۴۷

وَالنَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا اَیَاْمُرُکُمْ بِالْکُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (القرآن : آل عمران)

کہ فرشتوں کو یا نبیوں کو بھی رب بنالو، بھلا وہ کفر کے لیے کہہ سکتا ہو، بعد اس کے کہ تم اللہ کے فرمانبردار بندے بن چکے ہو؟

ایک دوسرے موقع پر ایک صاحب نے بارگاہِ نبوت میں عرض کیا کہ "جو خدا چاہے اور آپ چاہیں"۔ انھیں فوراً ٹوکا گیا کہ "تم نے مجھے خدا کا شریک اور ہمسر ٹھہرایا کہو کہ جو تنہا خدا چاہے"۔[1]

ایک صحابی قیس بن سعد کو حیرہ جانے کا اتفاق ہوا، وہاں انھوں نے دیکھا کہ لوگ جب رئیس شہر کے دربار میں جاتے ہیں تو سجدہ کرتے ہیں لوٹ کر آئے تو حضور سے عرض کیا کہ آپ کو سجدہ کیا جائے تو آپ زیادہ مستحق ہیں"۔ جواب ملا۔ "تم میری قبر پر گذروگے تو سجدہ کروگے؟" ——— کہا۔ "جی نہیں"۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ "تو پھر جیتے جی بھی سجدہ نہ کرنا چاہیے"۔[2]

ایک بار حضور کہیں جارہے تھے، راستہ میں آپ کو دیکھ کر ایک شخص پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ کانپنے لگا۔ آپ اس کے قریب تشریف لے گئے اور فرمایا۔ "ڈرو نہیں۔ میں ایک ایسی قریشی خاتون کا بیٹا ہوں جو خشک گوشت کے ٹکڑے کھایا کرتی تھی"۔[3]

یہی وہ بوئے جنسیت ہے جس کے بغیر صحیح عقیدت کے صحیح جذبات نہیں پیدا ہوتے، اور عقیدت کے صحیح جذبات پیدا کیے بغیر کسی نبی یا مصلح کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ انبیاء اور صالحین کی پرستارانہ تعظیم و تکریم اگرچہ ان کو خدائی کے مرتبہ تک نہیں پہونچا سکتی،

---

[1] امام بخاری۔ ادب المفرد [2] ابوداؤد۔ کتاب النکاح [3] ترمذی

مگران کو کوئی نقصان بھی نہیں پہونچا سکتی، البتہ ان کے نیازمندوں اور معتقدوں کے لیے بے حد ضرر رساں اور ان کو گمراہی کی پستی میں ڈھکیلنے والی اور خدا سے دور کرنے والی چیز ہے، قرآن مجید میں یہودیوں اور عیسائیوں کی مذمت کرتے ہوئے ان کا بڑا جرم یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ:-

اِتَّخَذُوا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ	"انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ	عالموں اور راہبوں کو اپنا رب بنا لیا ہو
ابْنَ مَرْيَمَ۔ (القرآن: توبہ)	اور مسیح بن مریم کو خدا قرار دیا ہے۔

چنانچہ اپنی بابت رسول اللہ صلعم کا یہ مستقل حکم تھا کہ "میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے نبیوں کی شان میں کیا ہے"[1]

خدا کی ہمسری یا اسکی مشیت میں دخیل ہونا کیسا، آپنے خود کو اس کے سامنے ہمیشہ عاجزوں سے زیادہ عاجز اور بے بسوں سے زیادہ بے بس ظاہر کیا ہے۔ اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ جو شخص جس قوت کا جتنا زیادہ علم رکھتا ہے، اس سے اتنا ہی زیادہ ڈرتا ہے۔

حضرت اسعد آپکے خاص مقرب تھے، آپنے قبا میں ان ہی کے مکان پر قیام فرمایا تھا، لہٰذا جب سنہ ۱ھ میں ان کا انتقال ہوا تو آپ کو بہت رنج پہونچا، یہودیو نے اس پر طعنہ دیا کہ اگر محمد (صلعم) واقعی خدا کے رسول ہوتے تو اس صدمہ میں کیوں مبتلا ہوتے، آپنے سُنا تو فرمایا۔" میں خدا کے یہاں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے کوئی

---

[1] بخاری۔ کتاب الانبیاء۔

اختیار نہیں رکھتا۔[۱]

اپنی عقل و دانائی پر انسان کتنا ہی نازاں کیوں نہ ہو، اس میں عجیب وغریب باتوں سے متاثر ہونے کا مادّہ، عارضی ہی طریقہ پر سہی ـــــ پایا جاتا ہے۔ اکثر وہ ان چیزوں کے آگے سر جھکا دیتا ہے جن کو وہ غیر معمولی سمجھے۔ اور جو اس کے قیاس و تجربے بالاتر ہوں، اور اسکے برعکس وہ بات جو مافوق الفطرت نہ ہو، اپنی صداقت کے باوجود کبھی کبھی اسکی روح کو متوجہ کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ (اسیلئے پیغمبروں کو دوسری تدبیروں کے ساتھ معجزوں سے بھی کام لینا پڑتا تھا) عربوں میں ناخواندگی اور جہالت کے باعث یہ کمزوری، بالخصوص نمایاں تھی، اور وہ ہر غیر معمولی بات دیکھ کر سہم جایا کرتے تھے، آنحضرت صلعم کے دور میں بھی بہت سے ایسے واقعات رونما ہوئے جنھوں نے ان کے اوہام زدہ ذہنوں کو چونکا دیا اور وہ خوف زدہ ہو کر آپ کی رسالت کے قائل ہوگیے، مگر آپنے ان خیالات کی ہمیشہ تردید کی اور لوگوں کو سوچنے اور سمجھنے کی نصیحت فرمائی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی صاحبزادے نہ تھے، ایک صاحبزادہ پیدا ہوئے جن کا نام آپنے ابراہیم رکھا، یہ قدرتی طور پر آپ کو بہت محبوب تھے، لیکن اللہ کی مشیت کہ دودھ پینے ہی کے زمانہ میں ان کا بھی انتقال ہوگیا، آپ کو بہت صدمہ ہوا، اتفاق سے اسی دن اس زور کا سورج گرہن پڑا کہ بالکل اندھیرا چھا گیا، عربوں میں قدیم زمانے سے یہ خیال رائج تھا کہ سورج گرہن کسی عظیم المرتبت شخص کے

---

[۱] طبری۔ ص ۱۲۶۲

مرجانے سے پڑا کرتا ہے، اسلئے اس واقعہ سے کفار اتنا متاثر ہوئے کہ ان میں سے کچھ آپؐ کے پاس گئے اور اپنی مخالفت کی معافی چاہی، آپ چاہتے تو ان کو فوراً اسلام میں داخل کر لیتے، لیکن اسلام نے چونکہ دین کی بنیا د تفکر و تدبر پر قائم کی تھی اور نبیؐ کے ذمہ حیوانِ عاقل کو اس کے پرور دگار کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے نہ کہ کرشمہ سازی سے دعوت دینا رکھا تھا، اسلئے آپ نے یہ پسند نہ فرمایا۔ اور لوگوں کو جمع کر کے اس کے متعلق ایک مستقل خطبہ دیا، جس میں لوگوں کو آگاہ کیا کہ " سورج اور چاند خدا کی نشانیاں ہیں، کسی کے مرنے یا جینے سے ان میں گہن نہیں لگتا۔"[1]

۳

اسلام سے قبل ولایت اور نبوت کے آلۂ شفاعت ہونے کا ایک بہت غلط تصور پھیلا ہوا تھا۔ اس کا خاص سبب یہ خیال تھا کہ جو نسبت ایک مطلق العنان بادشاہ اور اسکی رعایا کے درمیان ہوتی ہے کم و بیش وہی خدا اور اسکے بندوں کے درمیان بھی ہے اور جس طرح ایسے بادشاہوں کے دربار میں مقربوں اور سفارشیوں کے بغیر رسائی نہیں ہو سکتی اسی طرح بارگاہ خداوندی میں بھی درمیانی وسائل کے بغیر شنوائی ہونا محال ہے یہ درمیانی وسائل ان لوگوں کے نزدیک دیوی، دیوتا، پیغمبر اور راہب وغیرہ تھے۔ اس لیے لوگ ان کی پرستش کرتے تھے اور کہتے تھے:۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا	" ہم ان کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ
اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (القرآن زمر)	وہ ہم کو اللہ کا تقرب حاصل کرا دیں "

---

[1] اس خطبہ کے الفاظ صحیح بخاری کتاب کسوف میں محفوظ ہیں۔ ان مقالات کے آخر میں بھی اسے شامل کر دیا گیا ہے۔

هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس) "یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں"

طبیعتیں جب انسانوں میں خدائی اوصاف دیکھنے کی عادی ہوجاتی ہیں تو وہ خدا کا اندازہ بھی انسانی عادات و اطوار پر لگانے لگتی ہیں۔ لوگ ظاہر پر غیب کو قیاس کرلیتے ہیں اور دنیاوی تجربات کی بنا پر خدائی معاملات کی بابت فیصلے کرنے لگتے ہیں۔ اسکے علاوہ انسان خود فریبی کی حد تک آسان پسند ہو۔ وہ دشوار مگر صحیح کے مقابلہ میں آسان مگر غلط کی طرف جلد مائل ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اسے آخرت کے خوف سے چھٹکارہ پانے کا یہ طریقہ بہت پسند آیا کہ اپنے دینی رہنماؤں کی سفارش و شفاعت پر کلی تکیہ کرلے۔

عیسائیوں میں آج بھی کفارہ کا عقیدہ عام ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ کو نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ اس پر بحث کرنا ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہم اسکے متعلق صرف دو عیسائی مفکرین ہی کی رائیں نقل کرنے پر اکتفا کرینگے۔

سر آرتھر کینن ڈائل (Sir Arthur Canon Doyle) نے لکھا ہے کہ :۔

"کسی کافر فرقہ نے بھی اس سے زیادہ بھونڈی بات نہیں اختراع کی کہ انسان موروثی گناہ کا داغ لے کر پیدا ہوتا تھا جس کے لیے وہ بذات خود ذمہ دار نہ تھا اور جس کے لئے کفارہ کی ضرورت تھی اور رب العالمین کو مجبوراً اپنے بے گناہ فرزند کی جان قربان کرنا پڑی تاکہ اس پُر اسرار لعنت کے اثر کو زائل کیا جاسکے"۔[۱]

---

[۱] ڈیلی ایکسپرس مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۲۵ء (ماخوذ از آئیڈیل پرافٹ۔ ص ۴۴)

اور ربیکا ویسٹ (Rebecca West) کا قول ہے کہ:-

"میرے نزدیک کفارہ کا عقیدہ مہمل ہے"۔ [۱]

اب کفارہ اور شفاعت کے اس عقیدہ کے متعلق قرآنی بیانات ملاحظہ ہوں:-

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ۔ (زخرف)

"یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، ہاں مگر وہ جس نے شہادت دی حق کی۔

وَكَم مِّن مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا (نجم)

"اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہونچاتی"۔

أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ۝ (زمر)

"کیا ان کافروں نے غیر اللہ کو شفیع بنایا ہے؟ کہدے کہ اگر یہ کچھ اختیار اور سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں تو بھی (شفیع بننے کے قابل ہیں)؟"

قیامت کے دن جب سارے پردے اٹھ جائیں گے تو ان کی مایوسی اور سراسیمگی دیکھنے کے قابل ہوگی جو خدا کے علاوہ کسی اور کو اپنی شفاعت کا ضامن سمجھے بیٹھے تھے۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُونَ ۝ وَلَمْ يَكُن لَّهُم مِّن شُرَكَائِهِمْ شُفَعَاءُ وَكَانُوا

"اور جب قیامت قائم ہوگی تو مشرکین مایوس ہو کر رہ جاویں گے اور جن کو وہ خدا کا شریک کار بتاتے تھے ان میں سے

---

[۱] ماخوذ از آئیڈیل پرافٹ، ص ۵۔

بُشُرَکَاۤءِ ہِمۡ کٰفِرِیۡنَ ٥ (روم) — کوئی ان کا شفیع نہ ہوگا" اور یہ انکار کریں گے ان شرکا سے۔

خاص کر یہودیوں کو ڈرایا گیا کہ :۔

وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّ لَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ (بقرہ) — "اے بنی اسرائیل ...... ڈرو اس دن سے جس میں کوئی کسی کے ذرا بھی کام نہ آئیگا اور نہ اسکی طرف سے کوئی بدلہ قبول ہوگا اور نہ شفاعت فائدہ دے گی۔"

اور عیسائیوں کو جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ مسیح کے جانشینوں یعنی پوپوں اور پادریوں کے سامنے اعتراف گناہ کرنے سے مغفرت ہو جاتی ہے سمجھایا گیا کہ :۔

وَمَنۡ یَّغۡفِرُ الذُّنُوۡبَ اِلَّا اللّٰهُ (آل عمران) — "(اور) خدا کے سوا گناہوں کو کون معاف کر سکتا ہے۔"

ان کے اس عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے کہ" روزِ قیامت خدا کا بیٹا یعنی مسیح خدا کے داہنے ہاتھ پر بیٹھ کے عدل و انصاف کرے گا" بتایا گیا کہ واقعہ یوں ہوگا کہ خدا حضرت عیسیٰ سے دریافت فرمائے گا کہ کیا تم نے لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی؟ —— اور وہ عرض کریںگے کہ اے پروردگار! میں نے تو ان کو وہی ہدایت دی تھی جس کا تو نے حکم دیا تھا اب

اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ٥ (مائدہ) — "اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو بخش دے تو (تو سب کچھ کر سکتا ہے کہ) تو غالب اور حکمت والا ہے۔"

الغرض اسلامی تعلیم یہ ہے کہ مغفرت کا معاملہ بس خدا کے ہاتھ ہے۔ کوئی دوسرا اس میں دخیل نہیں۔ انبیاء کی شفاعت کا یہ خود مختارانہ تصور اور عقیدہ باطل ہے۔ خدا جسے چاہے گا اپنی رحمت سے نوازے گا، اور جسے چاہے گا اُسے سزا دے گا۔ البتہ اس کی اجازت اور رضامندی سے اسکے رسول اور صالحین دوسروں کے حق میں شفاعت کر سکیں گے۔

مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ (یونس)	"خدا کی بارگاہ میں کوئی شفیع نہیں لیکن اسکی اجازت کے بعد"
مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ (بقرہ)	"وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کر سکے، لیکن اسکی اجازت سے"

اور یہ شفاعت بھی ہر شخص کے لئے نہ ہو سکے گی۔ صرف وہی اس سے فیض یاب ہونگے جن کو خدا چاہے گا۔

وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُمْ مِنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ۝ (انبیاء)	اور وہ شفاعت نہیں کریں گے علاوہ اسکے جس کے لئے خدا اپنی خوشنودی ظاہر کرے اور وہ اسکے خوف سے ترساں ہونگے۔

اور جن کا جرم خدا کے نزدیک ناقابل معافی ہوگا ان کے حق میں کسی کی بھی دعا یا سفارش کارگر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ بعض منافقین کے لئے آپنے دعاء مغفرت کی تو جواب ملا۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ (توبہ)	"تم ان کی مغفرت چاہو یا نہ چاہو۔ اگر تم ان کے لئے ستر دفعہ بھی مغفرت چاہوگے تو خدا ان کی مغفرت نہ کرے گا"

تکرار قرآن کا ایک خاص اسلوب ہے، شفاعت کے مسئلہ میں بھی یہی اسلوب اختیار

کیا گیا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر بار بار اور طرح طرح سے روشنی ڈالی گئی ہو تاکہ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت آپ کے بعد کسی طرح کی غلط فہمی میں گرفتار نہ ہو سکے۔

ہر شخص کو اپنے اعزا اور احباب کی فلاح محبوب ہوتی ہے حضور کو بھی فطرتاً اپنے اعزا کی مغفرت کی فکر رہتی تھی۔ چنانچہ آپ نے اپنے بعض ایسے قریبی عزیزوں کے لئے دعائے مغفرت کرنا چاہی جن کو اسلام کی دولت نصیب نہیں ہوئی تھی تو آپ کو اس کی اجازت نہیں ملی۔[1]

نیز اسی خیال سے کہ آپ کے اقربا، شرف قرابت کی وجہ سے خوف آخرت سے غافل نہ ہو جائیں آپ نے ان کو جمع کر کے نصیحت فرمائی کہ "اے قریشیو! اے اولاد عبد المطلب (آپ کے دادا)! اے عباس (آپ کے چچا)! اے صفیہ (آپ کی پھوپھی)! اے فاطمہ (آپ کی صاحبزادی)! میرے مال سے جو مانگو میں دے سکتا ہوں لیکن خدا کے یہاں میں تمہارے لئے کوئی اختیار نہیں رکھتا۔[2]

نیز اپنے بارے میں بھی فرماتے تھے کہ:۔

"میں پیغمبر ہو کے بھی نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا۔"[3]

(۴)

مختلف انبیاء اپنے ساتھ اُصول دین کے علاوہ شریعتیں بھی لاتے تھے۔ اُصول دین کا تعلق خدا کی ہستی، اسکی توحید، اسکی صفات کاملہ، اسکی خالص عبادت، رسولوں کی بعثت، یوم آخر، اچھے اور بُرے اعمال کی باز پرس اور جزا و سزا جیسے بنیادی اور اُصولی

---

[1] مسلم۔ کتاب الجنائز [2] بخاری [3] بخاری۔

امور سے ہے۔ اور شرع کے معنی راستہ کے ہیں۔ یہ اُصولِ دین کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت کی چیز ہے اور اصل مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہے۔

سارے پیغمبر ایک ہی خدا کے فرستادہ ہونے کے باعث اصولاً ایک ہی پیغام لے کر آتے تھے۔ یعنی اصولی طور پر ان سب کی ایک ہی دعوت تھی اور سب کا ایک ہی دعویٰ تھا۔ چنانچہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد علیہم السلام تک جتنے سچے مذہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے اور اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے۔ جو اختلاف ان مذاہب میں بعد میں پیدا ہوا وہ در اصل خود انسانوں کا پیدا کیا ہوا ہے جن کے نسیان وتغافل اور تصرّف وتحریف نے دین اور اسکے ساتھ انسانیت کے پُرزے کر ڈالے ہیں اور خدا کی بہترین مخلوق کو بے شمار فرقوں اور گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصّٰى	اس نے متعین کر دی ہے تمھارے لئے دین
بِهٖ نُوحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ	کی وہی راہ جس کا حکم نوح کو دیا تھا اور
اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ	جس کی ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس
وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى الآیۃ	کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ
(شوریٰ)	کو دیا۔ الخ

مگر جزئیاتِ احکام یعنی شرع یا منزلِ مقصود تک پہونچنے کا راستہ ہر مذہب اور قوم کی زمانی ومکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتا رہتا تھا۔ گویا ایک ہی روشنی مختلف محفلوں میں وقت اور شرکائے محفل کے تقاضہ اور مذاق کے اعتبار سے مختلف قندیلوں میں سے چھن چھن کر آتی تھی۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (مائدہ) "ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک دستور العمل اور ایک راستہ بنا دیا"

اس آیت سے ایک طرف یہ واضح ہوتا ہے کہ راستوں کا اختلاف منزل کے مختلف ہونے کی دلیل نہیں ہے اور دوسری طرف یہ کہ شرعی احکام و قوانین کے اختلافات بھی خدا ہی کی طرف سے تھے اور ان میں انبیاء کی رائے یا پسند کو دخل نہ تھا، اور اگر اس نے آخر میں سب کے لیے ایک ہی دستور العمل بنا دیا تو یہ اس کا حق تھا۔

انبیاء صرف شارح تھے شارع نہیں۔ ان کا منصب اور کام خدا کے قانون کی تشریح اور وضاحت اور اس قانون کی روشنی میں لوگوں کے دلوں میں خوف خدا پیدا کرنا تھا، قانون وضع کرنا نہیں۔

مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ (مائدہ) "ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچا دینا ہے"

إِنَّمَا أَنْتَ نَذِيرٌ (رعد) "(اے رسول) تو تو صرف ڈرانے والا ہے"

(۵)

غرضکہ نبوت کے اسلامی تصور کا لب لباب یہ ہے کہ انبیاء نہ خدا تھے، نہ خدا کے بیٹے، نہ خدا کے اوتار، نہ خدا کے شریک نہ اس کے ہم پلہ و ہمسر اور نہ وہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی طرح خدا سے کشتی ہی لڑتے تھے[۱]۔

انبیاء خدا کے بندے اور اسکے عبد تھے۔ ہماری ہی طرح ایک بشر لیکن پاک صاف، برگزیدہ

---

[۱] توراۃ (آیت ۲۲ تا ۲۹) میں حضرت یعقوب کا خدا سے کشتی لڑنے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

ومعصوم۔ خدا فتنہ اور شر سے ان کی حفاظت کرتا تھا، ان پر اپنے احکام نازل فرماتا اور وہ ان احکام کو قول سے اور عمل سے دوسرے انسانوں تک پہونچاتے تھے۔ ان سب کا دین واحد تھا اگرچہ شریعتیں مختلف تھیں۔

خدا کے پیغام میں تبدیلی یا اضافہ کرنا ان کے اختیار میں نہ تھا اور نہ وہ اپنی یا کسی اور کی بابت اس کے یہاں کوئی طاقت ہی رکھتے تھے۔ خدا کی مرضی، اسکی عادت وسنت اور اسکے حکم کے سامنے وہ ایسے ہی بے دست وپا تھے جیسے کہ ہم اور آپ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یہ صداقتیں اتنی نمایاں اور واضح ہیں کہ جبکہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت موسیٰ کلیم اللہ، اور حضرت عیسیٰ روح اللہ کے القاب سے مشہور ہوئے آپ کا مستقل لقب ہی عبداللہ پڑ گیا۔

یہ معتدل اور متوازن تعلیم انسانوں کے حق میں کتنی مبارک ثابت ہوئی اور ان میں حق پرستی، حریت فکر اور خود اعتمادی کی اعلیٰ صلاحیتوں کی افزائش میں اس سے کیا مدد ملی اس کا اندازہ اس خطبہ سے ہوتا ہے جو خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر دیا تھا[۵]۔

مَن کانَ یَعبُدُ محمّدًا فَاِنَّ	(اے لوگو!) جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی
محمّدًا قَد مَاتَ وَمَن کَانَ	عبادت کرتا تھا اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ
یَعبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ	محمد کا انتقال ہو گیا ہے اور جو کوئی اللہ کی
لایموت ــــــ وما محمّد''	عبادت کرتا تھا تو اللہ بے شک زندہ ہے

۵۔ بخاری، باب مرض النبی۔

الّا رسولٌ قد خلت من قبلہٖ
الرُّسُل أفإن مات او قُتِلَ
انقلبتم علیٰ اعقابکم ومن
ینقلب علیٰ عقبیہ فلن
یضرّ اللہ شیئاً وسیجزی
اللہ الشاکرین ۰

اس کو کبھی موت نہیں (اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ)
محمد صرف رسول ہی تو ہیں (اور) ان سے
پہلے کتنے ہی رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر
وہ مرجائیں یا شہید کر دیے جائیں تو تم
الٹے پاؤں پھر جاؤ گے ؟ اور (یاد رکھو)
جو کوئی ایسا کرے گا وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑ
سکے گا ! اور اللہ ان لوگوں کو عن قریب
اچھا صلہ دیگا جو شاکر رہیں گے۔

دوسرا مقالہ

حیاتِ طیبہ (۱)

ولادت سے ہجرت تک

اِقرأ باسمِ ربّکَ الَّذِی خَلَق

("پڑھ اس خدا کے نام سے جس نے کائنات کو پیدا کیا"..... القرآن، علق)

شرقِ اوسط کی اہمیت عہد حاضر کی سیاست ہی کی پیداوار نہیں ہے۔ پرانی دنیا میں بھی اسے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

اس خطہ کا قلب وہ حصہ ہے جو خلیجِ فارس، بحیرۂ عرب، بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ روم سے قریب قریب گھرا ہوا ہے۔ یہ علاقہ پرانی دنیا کے وسط میں، یورپ، ایشیا اور افریقہ کے مقامِ اتصال پر واقع ہے، اسی لئے اسے پرانے زمانہ میں "دنیا کی ناف" کہتے تھے۔

قدیم ترین زمانہ سے اس جزیرہ نما میں بڑی بڑی تہذیبیں پیدا ہوتی رہیں اور ایشیا کے دوسرے ملکوں اور یورپ اور شمالی افریقہ میں جو مختلف تہذیبیں پروان چڑھیں وہ یہاں آکر ایک دوسرے سے گلے ملتی رہیں۔ جب بحیرۂ روم اور بحرِ ہند کے درمیان ساری تجارت خشکی کے راستہ سے ہوتی تھی اس وقت شام، فلسطین، حجاز، یمن اس

بڑی شاہراہ پر واقع تھے جو مغرب سے مشرق کو ملاتی تھی اور یہاں کے لوگوں کو دنیا کے تمام حصوں سے تعلقات پیدا کرنے اور ان پر اثر ڈالنے کے ایسے مواقع حاصل تھے جو دوسری قوموں کو نہ تھے۔ بین الاقوامی تہذیب اور عالمگیر انسانی برادری کا تصور اگر دنیا میں کہیں پیدا ہو سکتا تھا تو اسی وسطی خطہ میں، چنانچہ چھٹی صدی عیسوی میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو امن و اخوت کا مژدہ یہیں سے سنایا۔

اسلام سے پہلے عرب میں کبھی کوئی باقاعدہ حکومت نہیں قائم ہوئی تھی۔ ظہورِ اسلام کے وقت اسکے سرحدی علاقے ——— اور ملک بھر میں وہی علاقے سرسبز و شاداب تھے ——— غیروں کے قبضے میں تھے۔ شمال میں حدود شام پر رومائی مشرقی شاخ سلطنت قسطنطنیہ کا اقتدار تھا، اور مشرق میں یمن، عمان اور بحرین فارس کے زیر نگیں تھے۔ وہاں کے عرب رؤسا کی حکمرانی بس برائے نام تھی، ملک کے اندر بھی ایرانیوں کا اثر رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا۔ اس کا اندازہ اس فرمان سے ہوتا ہے جو ۶ھ میں شاہ ایران نے آنحضرت صلعم کے متعلق یمن کے ایرانی گورنر کے نام جاری کیا تھا کہ "میرے غلام کو جو حجاز میں مدعی نبوت بنا ہے گرفتار کر کے میرے پاس بھیجدو"

عربوں کا سیاسی اور معاشرتی نظام قبائلی طرز کا تھا۔ وہ مختلف قبیلوں میں بٹے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک الگ سردار تھا۔ شمال میں بکر، شیبان، لخم، تغلب، جذام، بنوحنیفہ طے، اسد، ہوازن، اوس، خزرج، ثقیف اور قریش وغیرہ آباد تھے۔ جنوب میں حمیری، اذواء اور اقیال کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ پہاڑوں اور صحراؤں میں خود مختار، جرائم پیشہ قبائل کی ٹکڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ رہزنی اور غارتگری انکا ذریعہ معاش

تھا سب سے زیادہ طاقتور یہودی تھے جو شام اور فلسطین پر رومی مسیحیوں کا تسلط ہو جانے کے بعد وسط ملک میں بکھر آئے تھے۔ ملک کی زیادہ تر تجارت ان کے قبضہ میں تھی، اور انھوں نے شام سے مدینہ تک قلعے تعمیر کر لئے تھے جو گوداموں کا بھی کام دیتے تھے اور چھاؤنیوں کا بھی۔

عرب قبائل مستقل آپس میں لڑا کرتے تھے۔ معمولی معمولی باتوں پر ان میں جنگ و جدال کا ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو برسوں ختم ہونے کو نہ آتا تھا۔ ان خانہ جنگیوں کے باعث بہت سے قبیلے تو مٹ ہی گئے تھے اور جو بچے تھے ان کی بھی حالت تباہ تھی۔

رہزنی اور لوٹ مار کو اگر الگ کر دیا جائے تو لوگوں کا ذریعہ معاش تجارت تھی، لیکن جہاں بدامنی کا یہ حال ہو وہاں تجارت کیا فروغ پا سکتی تھی۔ تجارتی قافلوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا سخت دشوار تھا، حد یہ تھی کہ حیرہ کے عرب بادشاہ تک کا تجارتی سامان آسانی سے منڈیوں میں نہیں پہونچ پاتا تھا۔ اکثر طاقتور قبیلے برسوں اپنے مقدس شہروں کا رُخ نہ کر پاتے تھے۔

مذہب کے معاملہ میں عام رجحان بت پرستی کی طرف تھا۔ ارواحِ خبیثہ سے لیکر چاند سورج تک سبھی کی پرستش کی جاتی تھی اور ان کے ناموں پر انسانوں تک کی قربانی کی جاتی تھی۔ زراعت میں زمین کا بہترین حصہ ان کے لئے وقف کر دیا جاتا تھا۔ خود خانہ کعبہ —— دُنیا کے بتکدہ میں پہلا وہ گھر خدا کا —— تین سو ساٹھ دیویوں اور دیوتاؤں کا استھان بن گیا تھا۔

یوں تو عربوں میں ایک مدت سے یہودیت، مجوسیت اور عیسائیت کا چرچا تھا، لیکن ان کا کوئی مفید اثر ان کے عادات و اخلاق پر نہیں پڑ سکا تھا ——

سر ولیم میور (SIR WILLIAM MUIR) لکھتے ہیں کہ "مدت العمر سے مکہ اور کل جزیرہ نما روحانی غنودگی کے عالم میں تھے۔ یہودیت، اور مسیحیت اور فلسفہ نے جو ادنیٰ اور عارضی اثر عرب کے ذہن پر ڈالا تھا وہ بس ان لہروں کی طرح تھا جو کبھی کبھی جھیل کی سطح پر نمودار ہو جاتی ہیں۔ سطح کے نیچے کا جمود ویسے ہی قائم رہا تھا۔"[1]

عرب کے باہر دنیا کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ روم اور فارس یہی اس زمانہ کی دو بڑی طاقتیں تھیں، فارس کی سلطنت عراق سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک پھیلی تھی، اور یورپ، ایشیا اور افریقہ تینوں براعظموں پر رومیوں کا غلبہ تھا۔ ان دونوں سلطنتوں میں بار بار جنگیں ہوا کرتی تھیں، جن سے ان کے وسائل کی بربادی ہوتی رہتی تھی اور دنیا کا امن چین غارت ہوا کرتا تھا۔

فارس میں بعثت سے قبل قباد اوّل بن فیروز کی حکومت تھی۔ اسکی نااہلی سے تنگ آکر رعایا نے اسکو قید کر دیا۔ قباد نے بھاگ کر تاتاریوں میں پناہ لی، اور انکی مدد سے دوبارہ تخت و تاج حاصل کیا۔ چھٹی صدی کے وسط میں قباد کی جگہ نوشیرواں نے لی۔ اس کا عدل مشہور ہے مگر درحقیقت اسکے ہاتھوں لاتعداد بے گناہ موت کے گھاٹ اترے۔ اس کا بیٹا نوشزاد تثلیث پرستی کی طرف مائل تھا۔ وہ اسکی پاداش میں قید ہوا اور بالآخر زردشتیوں سے جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔ ۵۷۹ء میں نوشیرواں کی موت کے بعد ہرمز چہارم تخت نشین ہوا۔ مگر بدنظمی اور سیاسی انحطاط کی روز افزوں ترقی کو وہ بھی نہ روک سکا۔

---

[1] سر ولیم میور "لائف آف محمد"۔ (SIR WILLIAM MUIR LIFE OF MOHAMMAD)

رومیوں کی عالمگیر سلطنت جو یونانیوں کے زوال کے بعد قائم ہوئی تھی چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں مشرقی اور مغربی دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی تھی، اور مشرقی بازو کے فرمانروا قسطنطین نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اسکی وفات کے بعد خانہ جنگیوں کی آگ بھڑکی۔ اس طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھا کر دور دراز کے صوبوں نے بغاوت کر دی اور سلطنت کا مغربی حصّہ بالکل جُدا ہو گیا۔ اُدھر گوتھ اور ونڈال جیسی وحشی قوموں نے قتل و غارت کا وہ بازار گرم کیا کہ پانچویں صدی ختم ہوتے ہوتے سلطنت روما کا وہی حال ہو گیا جو عام طور پر ہر سلطنت کا اسکے آخری دور میں ہو جایا کرتا ہے۔

ساتویں صدی کی ابتدا میں رومیوں پر ایرانیوں نے اتنا سخت حملہ کیا کہ آناً فاناً اناطولیہ، شام، فلسطین اور مصر ان کے قبضہ سے نکل گئے اور دارالسلطنت قسطنطنیہ کا ایرانیوں نے محاصرہ کر لیا۔ مجبور ہو کر شہنشاہ ہرقل نے ایرانی سپہ سالار کی صلح کی انتہائی توہین آمیز شرطوں کے سامنے سر جھکا دیا اور کثیر المقدار سونے چاندی کے علاوہ ایکہزار ناکتخدا لڑکیاں بھی ایرانیوں کے حوالے کیں۔

روحانی اور اخلاقی طور پر دنیا سچ مچ ایک ظلمتکدہ تھی۔ یورپ پر قرون وسطیٰ کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، ایران پر مزدکیت مسلّط تھی اور ہندوستان پرانے عہد کی تاریکی میں بھٹک رہا تھا۔

یہودیت کو جو فروغ داؤد علیہ السلام کے عہد میں حاصل ہو گیا تھا وہ بالکل عارضی ثابت ہوا، اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان کے دور ہی میں انکی تاریخ مظلومی اور جلاوطنی کی داستان بننا شروع ہو گئی تھی۔ پہلی صدی عیسوی میں فلسطین ان سے خالی ہو گیا تھا اور چوتھی صدی کے آغاز میں قسطنطین اعظم کے عیسائی ہو جانے کے بعد ان کی قومیت کہیں بھی

تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ عہد سلیمانی ہی میں ان میں بُت پرستی رائج ہو گئی تھی۔ وہ صحیفۂ ربانی یعنی توریت سے محروم ہو چکے تھے۔ اور حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز راہبوں کے فیصلہ پر مبنی تھی جو شرعی فتاویٰ کا کاروبار کرتے تھے۔ انبیاء کی تکذیب، سود خوری، تجارت میں بے ایمانی، عہد شکنی، محسن کشی اور منافقت ان کے نسلی کردار کی خصوصیتیں بن گئی تھیں۔ قرآنِ مجید میں ان کے دینی اور اخلاقی پستی کی بار بار مذمت کی گئی ہے۔

وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذَالِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ٥ (سورۂ بقرہ)

اور وہ ناحق پیغمبروں کو مار ڈالتے ہیں، اس لیے کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھنے والے ہیں۔

سَمّٰعُونَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُونَ لِلسُّحْتِ (سورۂ مائدہ)

اور جھوٹ باتوں کے سننے والے اور حرام مال کے بڑے کھانے والے ہیں۔

وَتَرٰى كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (سورۂ مائدہ)

اور تو ان میں سے اکثر کو دیکھے گا کہ گناہ اور تعدی کی طرف بڑی تیزی سے بڑھتے ہیں۔

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ۔ (سورۂ نساء)

اور چونکہ وہ سود خوری کرتے ہیں حالانکہ ان کو سود سے منع کر دیا گیا تھا اور چونکہ وہ لوگوں کا مال خورد برد کر جاتے ہیں۔

مسیحیت آئی تھی بُت پرستی کا انسداد کرنے مگر خود اس کا شکار ہو گئی تھی حضرت عیسیٰ کی تشریف بری کے بعد ان کے شاگردوں میں ایسے گہرے اختلاف پیدا ہوئے کہ انھوں نے

مذہب کو کئی ٹکڑوں میں بانٹ ڈالا۔ پولوس اور اسکے بعد اسکے شاگرد رشید پطرس نے حضرت عیسیٰ کی تعلیمات میں رومیوں کی اصنام پرستی اور یونانیوں کی فلاطونیت کا رنگ بھر کر توحید کی جگہ تثلیث کو رائج کیا، جگہ جگہ مذہبی کاؤنسلیں قائم ہوئیں اور روما، قسطنطینہ شام اور مصر کے اہل کلیسا ایک دوسرے کو خارج از دین ہونے کے فتوے دینے لگے۔ نوبت مناظروں سے گذر کر جنگ وجدال تک پہونچی اور چھٹی صدی کی ابتداء میں عیسائیوں میں آپس میں ایسا تصادم ہوا کہ کم وبیش ایک لاکھ عیسائیوں کو جلا وطن ہونا پڑا۔

سر ولیم میور (SIR WILLIAM MUIR) لکھتے ہیں کہ "مسیحیت (خود) ساتویں صدی میں مجہول، کمزور اور ناکارہ تھی"[۱] اور ایڈورڈ گبن (EDWARD GIBBON) نے اسکی تشریح یوں کی ہے کہ "ساتویں صدی میں احمق عیسائیوں نے کفر سے کھلی ہوئی مشابہت پیدا کر لی تھی۔ وہ اپنی منتیں ان تمام بتوں کے حضور میں پیش کرتے تھے جو مشرقی عبادت گاہوں کی رسوائی کا سبب بنے ہوئے تھے، اور انہی کے ناموں پر خلوت و جلوت میں قسمیں کھاتے تھے۔ خدائے قادر و توانا کا تخت شہیدوں، ولیوں اور فرشتوں کے ہجوم سے تاریک ہو رہا تھا"[۲]۔

اس وقت تیسرا بڑا مذہب مجوسیت یعنی آتش پرستی تھی جو ایرانیوں میں شروع سے جاری تھی اور ان کی طویل و عریض سلطنت قائم ہو جانے پر دور دور پھیل گئی تھی۔

---

[۱] "لائف آف محمد" (LIFE OF MOHAMMAD)

[۲] ایڈورڈ گبن "ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر" ——— حصہ دوم

(EDWARD GIBBON "DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE" VOL II)

زردشت نے روشنی و تاریکی کی دو علیحدہ حیثیتوں پر خیر و شر کی جداگانہ حیثیتیں قیاس کر کے ان کے الگ الگ خدا، یزداں اور اہرمن، تصور کر لئے تھے۔ اس کے بعد مانی نے مسیحیت کے اشتراک سے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی جس کا اصل الاصول یہ تھا کہ ظلمت یعنی بدی پر دائمی فتح پانے کی ایک یہی صورت تھی کہ نسلِ انسانی کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے اور انسان کامل تجرّد کی زندگی بسر کریں۔ ترکِ ازدواج کے اس انوکھے فلسفہ کا ردِّ عمل ضروری تھا اور پھر ایرانی جیسی قوم میں جہاں جنسی معاملات میں سدا سے آزادی چلی آرہی تھی اور باپ کا بیٹی کو اور بھائی کا بہن کو زوجیت میں لے لینا ایک معمولی بات سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ایرانی وقار کے ڈھلتے ہوئے عہد میں بعثتِ محمدی سے کچھ قبل مزدک نے زر، زمین، زن کی مشترک ملکیت کا اعلان کیا، اور عیش پرست اُمراء اور عوام دونوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہا۔ زر اور زمین کے معاملہ میں تو اس کی تعلیم کچھ زیادہ مقبول نہیں ہوئی مگر ہوس رانی اور آوارگی کا بازار خوب گرم ہوا اور ظلم و استبداد کی بھی حد نہ رہی۔

ہندوستان مہابھارت کی جنگ کے بعد بالکل ویران ہو گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ جنگ چار سو سال یعنی چودھویں صدی قبل مسیح تک ٹھنی رہی تھی اور سارے ملک میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس نے کسی ایک فریق کی طرف سے حصّہ نہ لیا ہو۔ چھٹی صدی ق۔م میں گوتم بدھ نے ہندوستان کو امن و آزادی کا نیا پیغام دیا۔ بدھ مت کے عروج کا زمانہ قریب قریب پانچویں صدی عیسوی تک رہا جس کے بعد کچھ تو اسکی ترکِ دنیا اور گداگری کی تعلیم اور کچھ برہمنوں کی مخالفت کے باعث اسے دیس نکالا مل گیا اور پرانک عہد کا آغاز ہوا۔ یہ دور ہندوستان کی تاریخ کا سب سے ناقص دور تھا۔ برہمنوں

نے خود کو کل قانونی اور اخلاقی قیدوں سے آزاد کر لیا تھا۔ ان کو کسی حالت میں بھی موت کی سزا نہیں دی جا سکتی تھی، جبکہ اچھوتوں کے لئے برہمنوں کو چھو لینا بھی سزائے موت کا حکم رکھتا تھا۔ برہمن کو گالی دینے والے کی زبان کاٹ ڈالی جاتی تھی۔ اونچی ذات کا مرد ہر نیچی ذات کی عورت سے ہم بستر ہو سکتا تھا۔ امراء کے یہاں ناچ گانے کی محفلیں آراستہ رہتی تھیں اور شاہراہوں پر آوارہ مزاج لوگوں کے ہجوم لگے رہتے تھے۔ ایک عورت کے متعدد شوہر ہو سکتے تھے۔ عورتوں کو مردوں کا غلام سمجھا جاتا تھا۔ اور تو اور وہ جوئے میں ہاری بھی جا سکتی تھیں۔ مندروں کے پجاری عقیدت مندوں کو لوٹتے تھے، جمادات و نباتات کی پرستش ہوتی تھی، خبیث روحوں پر عقیدہ رکھا جاتا تھا اور وباؤں کے زمانہ میں خاص طور پر انہی سے رجوع کیا جاتا تھا۔[1]

رات کے بطن سے دن، تاریکی کے بطن سے نور پیدا ہوتا ہے۔ دنیا کی یہ زبوں حالی درحقیقت اسکی حیاتِ نو کا پیش خیمہ تھی۔ تاریخ تمدن کے ایک ماہر نے اس مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ "معلوم ہوتا تھا کہ جس عظیم الشان تہذیب کو دنیا نے چار ہزار برسوں میں تعمیر کیا تھا وہ تخریب کی آخری حد کو پہنچ گئی تھی اور انسانیت اس دور کی طرف پھر لوٹ جانا چاہتی تھی جس میں نظم و نسق انجانی چیز تھے اور ہر قبیلہ اپنے ہمسایہ کے خون کا پیاسا رہتا تھا، پرانی قبائلی بندشیں ڈھیلی پڑ چکی تھیں، اسی لئے قدیم شہنشاہی طریقے کارگر نہ ہوتے تھے، مسیحیت نے جو نئے اصول چلائے تھے وہ امن و اتحاد پیدا کرنے کے بجائے منافرت اور بدامنی کے محرک نکلے تھے، یہ دور بڑا المناک تھا،

---

[1] آر، سی، دت "اینشنٹ انڈیا" (R. C. DUTT: ANCIENT INDIA)
"ستیارتھ پرکاش"

تہذیب کا دیو پیکر درخت جس کی شادابی عالم در کنار تھی اور جس کی شاخیں ادب اور سائنس کے بیش بہا پھل لایا کرتی تھیں اب خشک ہو رہا تھا، اس کے تنے کی قوتِ نمو زائل ہو چکی تھی ...... جنگوں نے اسکی جڑوں کو برباد کر ڈالا تھا۔ اور وہ محض فرسودہ رسموں اور کھوکھلے رواجوں کے سہارے کھڑا تھا۔ ہر وقت اسکے گر پڑنے کا خطرہ تھا، کیا کوئی ذی روح تمدن ایسا تھا جس کے ذریعہ نوع انسانی کو ایک بار پھر یکجا کر کے تہذیب کو بچایا جا سکتا تھا؟ ضرورت اسکی تھی کہ یہ تمدن نئے طرز کا ہو کیونکہ پرانے تصورات اور رسومات مر چکے تھے اب ان کے نمونہ پر دوسرے اصول اور طریقے مرتب کرنے کے لئے صدیاں درکار تھیں[۱]۔"

چنانچہ چھٹی صدی عیسوی کے آخری ثلث میں عرب کے قبیلہ قریش کی ہاشمی شاخ کے عبد اللہ بن عبد المطلب کے گھرانے سے آفتاب رسالت طلوع ہوا، جس نے آن کی آن میں تاریخ انسانی کی رات کو دن میں بدل دیا۔

۲

شہنشاہ کونین سیدنا و مولانا حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت کے بارہ میں مختلف روایتیں ہیں۔ قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری کی تحقیق ہے کہ آپ موسم بہار میں دوشنبہ کے دن ۹ ربیع الاول عام الفیل، مطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء و یکم جیٹھ سمت ۶۲۸ بکرمی کو صبح صادق کے بعد اور طلوع آفتاب کے قبل مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے[۲]۔

---

[۱] ماخوذ "از ریکانسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام" از ڈاکٹر محمد اقبال
(RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM)

[۲] رحمۃ للعالمین

آپ ماں کے پیٹ ہی میں تھے کہ یتیم ہو گئے۔ چھ سال کی عمر میں جب والدۂ ماجدہ بھی انتقال فرما گئیں تو دادا نے آپکو اپنے آغوش تربیت میں لیا، دو برس بعد وہ بھی دنیا سے منھ موڑ گیے۔ اب آپ کی کفالت و تربیت کی ذمہ داری آپکے چچا ابو طالب نے لی، وہ اپنے یتیم بھتیجے پر بیحد مہربان تھے، ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے، ساتھ ہی کھلاتے اور ساتھ ہی سلاتے۔

چونکہ اس زمانہ میں عربوں میں تعلیم کا دستور نہیں تھا، اس لئے آپ اُمّی ہی رہے، سِن شعور کو پہنچکر جب کسب معاش کی فکر ہوئی تو آپ بھی اپنے خاندانی پیشے تجارت میں داخل ہو گئے۔ سرمایہ کی کمی کی وجہ سے ذاتی کاروبار ممکن نہ ہو سکا، دوسروں کی شرکت میں کام شروع کیا، تھوڑے ہی دنوں میں لوگ آپکے قول کی سچائی، وعدہ کی پابندی اور معاملت کی صفائی کا دم بھرنے لگے، آپ کا لقب ہی "امین" پڑ گیا، تاریخ اور احادیث کی کتابوں میں اس دور سے تعلق رکھنے والی بیسیوں روایتیں پائی جاتی ہیں جو آپکے اعلیٰ خصائل کی شہادت دیتی ہیں، ایفائے عہد کے سلسلہ میں عبداللہ بن ابی الحمس کی روایت نے تو ضرب المثل کی شکل اختیار کر لی ہے، انھوں نے آپکے ساتھ خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا تھا، کچھ بات ہو چکی تھی، کچھ باقی تھی کہ وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے کہیں چلے گئے، اتفاق سے یہ بات ان کے ذہن سے اُتر گئی، تیسرے دن جب وعدہ یاد آیا تو گھبرا کے جائے مقررہ پر پہنچے، آپ کو اُسی جگہ منتظر پایا۔ دوسرا ہوتا تو کیا کچھ نہ کہتا۔ آپنے صرف اتنا کہہ کر بات ختم کر دی۔ "تم نے مجھے زحمت دی۔ میں تین دن سے یہیں تمھارا انتظار کر رہا ہوں"۔[۵۱]

---

[۵۱] ابوداؤد جلد ۲، صفحہ ۳۲۶

کچھ عرصہ بعد حضرت خدیجہؓ کے ساتھ آپ کا عقد ہو گیا، عقد کے موقع پر آپ کے چچا ابوطالب نے خطبہ پڑھا، انھوں نے کہا "تحقیق محمد بن عبداللہ میرا بھتیجا ایسا جوان ہے کہ قریش میں کوئی دوسرا مرد اسکے مقابلہ کا نہیں ہے اور وہی سب سے فائق اور ممتاز ہے، اگرچہ اسکے پاس مال و متاع کم ہے"[1]

حضرت خدیجہؓ ایک دولت مند بیوہ تھیں، چنانچہ شادی کے بعد آنحضرت صلعم کو فکر معاش سے رہائی مل گئی اور آپ اپنا وقت غور و فکر اور لوگوں کی خدمت کرنے میں صرف کرنے لگے۔ ملک کی بدامنی کی طرف بھی آپ نے توجہ فرمائی اور کچھ بااثر لوگوں کو ساتھ ملا کر ایک انجمن قیام امن کی خاطر قائم کی، اس انجمن کے ممبروں کو اس بات کا حلف لینا پڑتا تھا کہ۔۔۔ "خدا کی قسم ہم سب مل کر ایک ہاتھ بن جائیں گے اور وہ مظلوم کے ساتھ رہ کر اس وقت تک ظالم کے خلاف اٹھا رہے گا جب تک ظالم مظلوم کا حق ادا نہ کر دے"[2]

عہد نبوت میں آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "اگر آج بھی کوئی اس انجمن کے نام پر مدد کے لئے پکارے تو میں سب سے پہلے جاؤں گا"[3]

پینتیس برس کی عمر میں خانہ کعبہ میں حجر اسود نصب کرنے والا واقعہ پیش آیا جس نے آپ کی عدل نوازی، فراست اور صلاحیت کشی پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

کعبہ کی عمارت چونکہ نشیب میں تھی اسلئے برسات میں شہر کا پانی صحن حرم میں بھر آتا تھا۔ اس کی روک کیلئے ایک بند بنوایا گیا تھا مگر وہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا اور عمارت کو بار بار نقصان پہونچتا تھا۔ آخر کو یہ طے پایا کہ پرانی عمارت گرا کر از سر نو تعمیر کی جائے۔ عمارت

---

[1] ریاض محمدیہ، ص۱۷ [2] روضۃ الانف [3] رحمۃ للعالمین جلد ۱ صفحہ ۴۷

کے بنانے میں تو سبھی قبائل نے مل کر شرکت کی لیکن جب حجرِ اسود کو نصب کرنے کا وقت آیا تو سخت اختلاف پیدا ہوا۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ یہ خدمت اسی کے ہاتھوں انجام پائے۔ بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہونچی کہ تلواریں کھنچ گئیں۔ عرب میں دستور تھا کہ جب کوئی شخص جان دینے کی قسم کھاتا تھا تو پیالہ میں خون بھر کر اس میں انگلیاں ڈبوتا تھا۔ چنانچہ بعض پرجوش لوگوں نے یہ رسم بھی ادا کرلی۔ چار دن تک برابر یہی صورت رہی۔ پانچویں دن ابو امیہ بن مغیرہ نے جو قریش میں سب سے زیادہ معمّر تھا، رائے دی کہ کل صبح جو شخص سب سے پہلے حرم میں آئے اسی کو حَکَم مقرر کر دیا جائے۔ سب نے یہ رائے مان لی۔ دوسرے دن قبائل کے تمام معزز آدمی موقع پر پہونچ گئے۔ اب اتفاق کہیے یا قدرتِ خداوندی کا کرشمہ کہ سب سے پہلے جو نظر آئے وہ آنحضرت صلعم ہی تھے۔ آپ کو دیکھنا تھا کہ لوگ خوش ہو کر پکار اُٹھے۔ ھٰذا الامین رضینا۔ (امین آگیا، ہم سب اسکے فیصلہ پر متفق ہیں)۔ آنحضرت چاہتے تو یہ شرف تنہا خود حاصل کرلیتے۔ مگر آپنے اسے پسند نہ فرمایا۔ آپنے ایک چادر بچھائی اور اس پر حجرِ اسود کو اپنے ہاتھ سے رکھ دیا۔ پھر تمام دعویدار قبیلوں کے سرداروں سے کہا کہ وہ چادر کو پکڑ پکڑ اٹھائیں۔ اسی طرح پتھر کو وہاں تک لایا گیا جہاں اسے نصب کرنا تھا۔ جب چادر موقع کے برابر آگئی تو آپنے حجرِ اسود کو اٹھا کر نصب فرمادیا۔ آپکے حسن تدبیر سے ایک خونخوار جنگ اتنی آسانی سے ٹل گئی۔[۱]

آپ کا بچپن اور شباب دونوں بے داغ گزرے۔ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو کہ

---

[۱] صحیح بخاری۔ باب ما ذکر فی الحجر الاسود

قبل بعثت بھی آپ تمام مشرکانہ رسوم اور دوسرے عیوب سے بالکل الگ رہے، آپ کے اس دور کے سارے احباب پاکیزہ اور اچھے لوگ تھے، سب سے زیادہ گہرے تعلقات حضرت ابوبکرؓ سے تھے جو برسوں شریک زندگی رہے تھے۔ سر ولیم میور بھی جو اسلام اور پیغمبر اسلام کی قدح کرنے والے مصنفوں کی پہلی صف میں شمار کئے جاتے ہیں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ "ہماری تمام تصنیفات محمدؐ کے چال چلن کی عصمت اور ان کے اطوار کی پاکیزگی میں جو اہل مکہ میں کمیاب تھیں متفق ہیں۔"[1]

بے داغ جوانی اور پاکیزہ اخلاق، بالخصوص عرب کے اس فسق و فواحش کے ماحول میں، بڑی چیزیں تھیں مگر جس کے مقدر میں کونین کی رہنمائی ہو اسے کچھ اور بھی درکار تھا۔ اسکی جستجو میں آپ کا انہماک بڑھتا گیا حتیٰ کہ دنیا کے مشغلے ہیچ نظر آنے لگے۔

مکہ سے تین میل پر ایک غار تھا جسے حرا کہتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کے دل کی اداسی جب زیادہ بڑھی تو آپ وہاں جا کر کئی کئی دن قیام فرمانے لگے، کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے اور جب وہ ختم ہو جاتا تو گھر جا کر پھر لے آتے اور عبادت میں مشغول ہو جاتے .... یہ عبادت کیا تھی؟ وہی جو آپ کے جدِ امجد حضرت ابراہیمؑ نے نبوت سے پہلے کی تھی یعنی "غور و فکر اور عبرت پذیری۔"[2]

"ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" (ON HEROES AND HERO WORSHIP) میں ٹامس کارلائل (THOMAS CARLYLE) نے اس عبادت کی یوں وضاحت

---

[1] لائف آف محمد (LIFE OF MOHAMMAD) [2] سیرۃ النبی جلد ۱ صفحہ ۲۰۱

کی ہے۔" سفر و حضر میں ہر جگہ محمدؐ کے دل میں ہزاروں سوال اُٹھتے رہتے تھے۔ میں کیا ہوں؟ یہ لامتناہی عالم کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ موت کسے کہتے ہیں؟ میں کن چیزوں پر اعتقاد رکھوں؟ کیا کروں؟ کیا غارِ حرا کی چٹانوں یا طور کی چوٹیوں یا صحراؤں کے سکوت نے ان سوالوں کا جواب دیا؟ نہیں۔ گردش کرتا ہوا نیلا آسمان، چکر لگاتے ہوئے دن رات، چمکتے ہوئے ستارے سب ان کا جواب دینے سے قاصر رہے۔"[۱]

آخر ایک دن فرشتۂ غیب نے اسرارِ نبوت کے لیے آپ کا سینہ کھول دیا، اس نے آواز دی۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ — "پڑھ اس خدا کے نام سے جس نے
الَّذِي خَلَقَ (سورہ علق) — کائنات کو پیدا کیا۔"

آپ جلالِ الٰہی سے کانپ اٹھے، سیدھے گھر آئے اور چادر اوڑھ کر لیٹ گئے، راز کی بات سننے کا بیوی سے زیادہ اور کون حقدار ہو سکتا تھا، آپ نے حضرت خدیجہؓ سے سارا واقعہ بیان کیا اور فرمایا مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔" حضرت خدیجہؓ نے ڈھارس بندھائی، انھوں نے کہا۔ "آپ تردد نہ فرمائیں، آپ مہماں نواز ہیں، اقربا کی مدد کرتے ہیں، بیواؤں، یتیموں اور بیکسوں کی دستگیری کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، خدا آپ کا ساتھ نہ چھوڑے گا۔"

حضرت خدیجہؓ کے ایک چچا زاد بھائی ورقہ تھے جو بڑے ذی علم اور توریت اور انجیل کے ماہر تھے، بیچاری آنحضرتؐ کو ان کے پاس لے گئیں، انھوں نے واقعہ کی کیفیت

---

[۱] "ہیرو ایز آ پرافٹ، محمدؐ" (HERO AS A PROPHET: MOHAMMAD)

سنی تو کہا۔ "یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ پر اترا تھا۔ تو آپ کو مبارک ہو کہ خدا نے آپ کو اپنا نبی بنایا ہے، عنقریب آپ کو تبلیغ کا حکم ملے گا، پھر ساری قوم آپ کی دشمن ہو جائے گی، کاش میں اُس وقت جوان ہوتا۔"[۱]

یہ واقعہ ۹ ربیع الاوّل سنہ ۴۱ میلادی مطابق ۱۲ فروری سنہ ۶۱۰ء کو بروز دوشنبہ پیش آیا تھا۔ جب (قاضی سلیمان منصور پوری کے حساب سے) آپ کی عمر چالیس سال ایک دن کی تھی۔[۲]

(۳)

جوناتھن سوفٹ (JONATHAN SWIFT) نے یہ بات بہت دلچسپ کہی ہے کہ تم میں جب کوئی غیر معمولی آدمی ابھرے تو تم اُسے اس علامت سے پہچان سکتے ہو کہ دنیا بھر کے گدھے اس کی مخالفت میں صف بستہ ہوں گے۔

آنحضرت صلعم انسانی فطرت کی اس خصوصیت سے واقف تھے، چنانچہ جب آپ کو تبلیغ کا حکم ملا تو آپ نے تدریج اور تدبیر سے کام لیا اور پہلے ان ہی لوگوں کو دین قیم پر لانے کی کوشش کی جو آپ سے بہت قریب تھے، یہ آپ کی بیوی حضرت خدیجہؓ، چچازاد بھائی حضرت علیؓ، آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ اور دیرینہ رفیق حضرت ابوبکرؓ تھے جو سنتے ہی ایمان لے آئے۔

حضرت ابوبکر بڑے فیاض، صائب الرائے اور ذی اثر تھے۔ اچھے اچھے لوگ اُن سے مشورہ کیا کرتے تھے، وہ اسلام لائے تو ان کو دیکھ کر مکہ کے کچھ اور معزز مین

---

[۱] صحیحین ملخصاً [۲] رحمۃ للعالمین جلد ۱، صفحہ ۵۲

بھی مسلمان ہو گئے، ان میں حضرت عثمانؓ جو بعد کو خلیفہ سوم ہوئے، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص جن کے ہاتھوں ایران فتح ہوا، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ شامل تھے۔ ان کے بعد مردوں میں حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت عامر بن عبداللہؓ حضرت عبدالاسدؓ بن بلال، حضرت عثمانؓ بن مظعون اور حضرت ارقمؓ اور عورتوں میں حضرت عباسؓ کی بیوی ام الفضل، حضرت ابو بکرؓ کی صاحبزادی اسماءؓ اور حضرت فاروقؓ کی بہن فاطمہؓ کو مسلمان ہونے کا شرف نصیب ہوا۔ یہ وہ لوگ تھے جو فطرت کی سلامتی، معقولیت اور حق پسندی میں ممتاز تھے۔

سارا کام نہایت احتیاط اور خاموشی سے ہوا۔ اور رازدارانِ خاص کے علاوہ کسی کو اسکی خبر نہ ہوئی، نمازیں چھپ کر گھروں کے اندر یا پہاڑوں کی گھاٹیوں میں ادا کی جاتی تھیں، ایک روز آنحضرت صلعم اور حضرت علیؓ کسی گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ کے چچا اور حضرت علیؓ کے والد ابو طالب آ نکلے، انھیں اس نئے طرز کی عبادت پر تعجب ہوا، نماز کے بعد انھوں نے پوچھا کہ "یہ کون دین ہے؟" آنحضرت صلعم نے جواب دیا "ہمارے دادا ابراہیمؑ کا یہی دین تھا" ابو طالب نے کہا "میں تو اسے اختیار نہیں کر سکتا، لیکن تم کو اجازت ہے"[۱]

تین برس تک اسلام کی اشاعت اسی طرح چپکے چپکے ہوتی رہی اور تیس آدمی اس کے حلقہ میں داخل ہوئے، چوتھے سال حکم الٰہی صادر ہوا فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (جو تجھے حکم دیا گیا ہے وہ بالا اعلان کہہ دے) اور یہ بھی تاکید کر دی گئی کہ رشد و ہدایت

---

[۱] سیرۃ النبی جلد ۱ صفحہ ۲۰۷

کی راہ پہلے گھر، پھر کنبہ اور قبیلہ سے گزر کر عوام الناس تک پہنچتی ہے۔ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (اور اپنے قرابت داروں کو اللہ سے ڈرا)

چنانچہ آپ نے اپنے گھر پر دعوت کا انتظام کیا اور عبدالمطلب کے کل خاندان کو مدعو کیا، کھانے کے بعد آپ نے ایک مختصر سی تقریر کی، آپ نے فرمایا۔ "میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جس میں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی ہے۔ اس بارِ عظیم کو اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا؟" ـــــــ محمد بن عبداللہ اور یہ دعوے! سننے والوں پر سناٹا چھا گیا۔ یکایک حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا۔ "اگرچہ مجھ کو آشوبِ چشم ہے اور میری ٹانگیں پتلی ہیں اور میں سب سے زیادہ نوعمر ہوں مگر میں آپ کا ساتھ دوں گا۔" اس وقت حضرت علیؓ کا سنِ شریف محض تیرہ سال تھا۔ لوگ ان کا مذاق اڑانے لگے، کچھ لوگوں نے ابوطالب سے کہا۔ "سلو، اپنے بھتیجے اور بیٹے کا حکم سن لیا۔ اب اس کے خلاف نہ کرنا۔" اور اس تمسخر اور ناگواری کی فضا میں مجلس برخواست ہو گئی۔

کچھ روز بعد آپ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر قریش کو آواز دی اور جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا۔ "تم میری بابت کیا رائے رکھتے ہو، مجھے سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا؟" آپ کی ساری زندگی انہی میں گزری تھی، وہ آپ کے صحیفۂ حیات کے ایک ایک ورق سے واقف تھے۔ سب ایک زبان ہو کر بولے۔ "ہم نے کبھی تمہارے منہ سے کوئی جھوٹی یا بیہودہ بات نہیں سنی۔ ہم جانتے ہیں کہ تم سچے اور امین ہو۔" تب آپ نے فرمایا۔ "اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے دشمن کا لشکر چھپا ہوا ہے تو کیا تم میری بات مان لو گے؟" لوگوں نے جواب دیا۔ "ہم تم کو سدا سے سچا سمجھتے آئے ہیں، تم اونچی جگہ پر کھڑے ہو اور پہاڑ کے اس طرف کا حال دیکھ سکتے ہو، جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔" آپ نے فرمایا۔

"تو پھر میں یہ کہتا ہوں کہ خدا ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے، موت برحق ہے اور مرنے کے بعد اُسی کے سامنے حاضر ہونا ہے، اگر ان باتوں پر ایمان لاؤ گے تو فلاح پاؤ گے اور دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو گے ورنہ تم پر بڑا عذاب نازل ہوگا۔" لوگ یہ سن کر بہت برہم ہوئے۔ انھوں نے کہا "کیا ہمیں اسی لیے بلایا تھا؟ بیکار ہمارا وقت برباد کیا۔" اور منتشر ہو گئے۔

مسلمانوں کی تعداد اب چالیس سے کچھ اوپر ہو گئی تھی، ایک دن آپ نے کعبہ میں جاکر توحید کا اعلان کر دیا جو قریش کے نزدیک انکی سب سے بڑی توہین تھی، وہ ہر طرف سے آپ پر ٹوٹ پڑے، حضرت حارث گھر پر تھے۔ ان کو خبر ہوی تو دوڑے ہوئے آئے اور آنحضرت صلعم کو بچانا چاہا۔ مگر ان پر اتنی تلواریں پڑیں کہ گر کر وہیں شہید ہو گئے۔ یہ پہلا خون تھا جو اسلام کی راہ میں بہا۔

خانہ کعبہ میں کلمۂ حق کا اعلان گویا قریش کو کھلا چیلنج تھا، عرب میں مکہ کی عظمت کعبہ ہی کے سبب سے تھی، قریش اسکے مجاور اور کلید بردار تھے۔ اس طرح عربوں پر انکی ایک قسم کی مذہبی حکومت تھی، وہ آل اللہ یعنی خاندان الٰہی کہلاتے تھے۔ اپنے آبائی عقائد کے خلاف جو سنا تو آگ بگولہ ہو گئے اور سنا بھی تو کس سے؟ ایک ایسے شخص سے جو پیدا ہونے سے پہلے یتیم ہو گیا تھا۔ جس کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ خود اپنا روزگار کر سکتا۔ جس کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی ——— یہ آخری بات کچھ کم اہم نہ تھی، کیونکہ تمام جاہل قوموں کی طرح عرب بھی اولاد نرینہ کو فضیلت اور آخرت کی خوش نصیبی کی نشانی سمجھتے تھے۔

قریش کہتے تھے کہ اگر ان میں نبی کو مبعوث ہونا ہی تھا تو یہ منصب قبیلہ کے کسی

رئیس کو ملتا۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (سورۂ زخرف)	اور انھوں نے کہا کہ قرآن کو اترنا تھا تو ان دونوں شہروں (مکہ وطائف) میں سے کسی رئیس پر اترتا تھا۔

دو چار کو چھوڑ کر اسلام کے ابتدائی دور میں ایمان لانے والے معمولی قسم کے آدمی تھے جن کی نہ تو قبیلہ میں کوئی ممتاز حیثیت تھی اور نہ وہ مال و دولت ہی کے مالک تھے، رؤسائے قریش ان کو دیکھتے تو ہنس کر کہتے ہیں۔

اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا (سورہ انعام)	یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم کو چھوڑ کر احسان کیا ہے۔

وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ بعثت سے کچھ قبل ہی قریش میں فجار کی زبردست جنگ ہو چکی تھی، جب میں اس کثرت سے کشت و خون ہوا تھا کہ طرفین نے ہار جیت کا انتظار کئے بغیر گھبرا کر صلح کرلی تھی اسکے زخم ابھی تازہ تھے ورنہ دعوت دین کے ساتھ ہی مکہ میں حشر برپا ہو جاتا۔

چنانچہ قریش نے ضبط و تحمل سے کام لیا اور انکے ایک وفد نے ابوطالب کے پاس جاکر آنحضرت صلعم کی شکایت کی، ابو طالب نے سمجھا بجھا کر واپس کر دیا، مگر جب آنحضرتؐ کی مساعی میں کمی کے بجائے ترقی ہی ہوتی گئی تو وہ پھر ابو طالب کے پاس گئے اور اس مرتبہ زیادہ صاف باتیں کیں، انھوں نے کہا۔ "تمھارا بھتیجہ ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے۔ ہم کو احمق ٹھہراتا ہے اور ہمارے آدمیوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اب تک ہم نے بہت ضبط کیا مگر اب بات حد سے تجاوز کر رہی ہے۔ اس لئے یا تو تم بیچ سے

ہٹ جاؤ یا کھُل کر میدان میں آجاؤ تا کہ ہم میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے۔"

ابُو طالب ایک تجربہ کار آدمی تھے، انھوں نے معاملہ کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے رسول اللہ صلعم کو سمجھایا کہ "جانِ عم، میں بڈھا ہو چکا ہوں۔ میرے اوپر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ میں اٹھا نہ سکوں۔" آپ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ فرمایا "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند لاکر رکھ دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔ میرا بھروسہ خدا پر ہے جو یا تو اس کام کو پورا کرائے گا یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا۔"

دل سے نکلی ہوئی بات سیدھی ابو طالب کے دل میں اُتر گئی۔ انھوں نے کہا "جب تک میرے دم میں دم ہے کوئی تمھارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔"[۵۱]

حضور سرورِ کائنات مکّہ کے گلی کوچوں میں گھوم پھر کر تبلیغ کرتے۔ بازاروں اور میلوں میں تشریف لے جاتے اور لوگوں کو دین کی باتیں سمجھاتے، ان کو جمادات اور نباتات سے منھ موڑ کر حقیقی معبود سے رشتہ جوڑنے کی نصیحت فرماتے، زنا سے روکتے جوا کھیلنے سے منع کرتے، خوش خلقی، عدل اور احسان کا سبق سکھاتے۔ فرماتے کہ لوگوں کو چاہیئے کہ اپنے جسموں کو نجاست سے، زبان کو گندی باتوں سے اور دلوں کو غلط عقیدوں اور کمینی خواہشوں سے محفوظ رکھیں۔"

آپ تبلیغ کے لئے نکلتے تو مخالفوں کی ٹولیاں ساتھ ہو جاتیں۔ جب آپ تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو یہ آپ کا مذاق اُڑاتے اور قہقہے لگاتے اور اتنا شور مچاتے کہ بات کرنا مشکل ہو جاتا۔ ابولہب لوگوں سے کہتا۔ "بھائیو! اس کی باتوں پہ

---

۵۱ امام بخاری، کتاب التاریخ۔

دھیان نہ دو، اس بیچارے کو جنون ہو گیا ہے" اور کوئی کہتا کہ "محمد شاعر ہو گئے ہیں اور یہ سب ان کی شاعری ہے"[1]

قریش کی مخالفت روز بروز بڑھتی گئی، وہ آپ کے راستہ میں کانٹے بچھاتے، جسم مبارک پر نجاست ڈالتے، گالیاں دیتے اور اکیلے دوکیلے مسلمانوں کو پا جاتے تو ان کو مارتے پیٹتے اور ذلیل کرتے، ایک روز آپ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے، ابوجہل نے آپ کے سر پر پتھر کھینچ مارا۔ حرم کعبہ میں ایک دفعہ سجدہ میں گئے تو اس نے آپ کی پیٹھ پر اونٹ کی اوجھڑی رکھ دی۔

حضرت بلالؓ اُمیّہ بن خلف کے غلام تھے۔ اُمیّہ نے ان کے مسلمان ہونے کو سُنا تو آپے سے باہر ہو گیا اور ان کے گلے میں رسّی ڈال کر بازاری لڑکوں کے ہاتھ میں دی کہ ان کو پہاڑیوں پر گھسیٹتے پھرو، یہ سزا ختم ہوئی تو انکو وادیٔ مکّہ کی گرم ریت پر لٹایا گیا اور تپتے ہوئے پتھر سینہ پر رکھے گئے۔ یہ عمل ہفتوں جاری رہا، بالآخر حضرت ابوبکرؓ نے انھیں خرید کر آزاد کیا۔[2]

حضرت خبّاب بن الارث بھی ایک غلام تھے، وہ مسلمان ہوئے تو گھر والوں نے زمین پر انگارے بچھا کر ان کے اوپر انھیں لٹا دیا، ایک شخص سینہ پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں، یہاں تک کہ انگارے بجھ گئے۔ حضرت خبّابؓ نے ایک عرصہ بعد یہ واقعہ حضرت عمرؓ سے بیان کیا اور پیٹھ کھول کر دکھائی تو وہ بالکل مبروص

---

[1] ابن ہشام   [2] طبقات ابن سعد، جلد ۳

کی سی معلوم ہوتی تھی[۱]۔

حضرت ابو فکیہہ کے سینے پر اتنا بھاری پتھر رکھا گیا کہ انکی زبان نکل پڑی[۲]۔

حضرت عثمانؓ صاحب حیثیت تھے، دو بکر نہ بول سکے تو خود ان کے چچا نے کھجور کے تنے سے باندھ کر ان کو خوب مارا[۳]۔

حضرت زبیر اسلام لائے تو ان کے چچا نے چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیا[۴]۔ سعید بن زید رسیوں میں جکڑ کر ڈال دیے گئے[۵] اور مصعب بن عمیر کو ان کی والدہ نے گھر سے نکال دیا[۶]۔

یہ چند مثالیں ہیں ورنہ ایسے واقعات تو ہر روز ہوا کرتے تھے، مسلمان یہ سب سہتے تھے اور ثابت قدم رہتے تھے، ایک مسلمان بھی ان ہولناک مظالم سے ڈر کر ایمان کے راستہ سے نہ ہٹا۔ علامہ شبلی نے گاڈفری ہگنس (GODFERY HIGGINS) کی کتاب "اپالوجیہ" (APOLOGIA) سے ذیل کی عبارت ترجمہ کر کے نقل کی ہے[۷]۔

"عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمدؐ کی تعلیمات نے اس درجہ نشہ دینی آپ کے پیرووں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰؑ کے ابتدائی پیرؤں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے، جب عیسیٰؑ کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے۔ انکا نشہ دینی جاتا رہا، اور

۱،۲ اعجاز التنزیل، صفحہ ۵۲ ۳ طبقات ابن سعد، جلد ۳ تذکرہ صحابہ بدر۔ ۴ تاریخ طبری

۵ صحیح بخاری ۶ اعجاز التنزیل ۷ سیرۃ النبی جلد ۱، صفحہ ۲۲۳

اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیئے......

برعکس اسکے محمدؐ کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپکے بچاؤ میں اپنی جانیں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا"

قریش کی بے رحمیوں سے تنگ آکر حضرت خبابؓ نے ایک دن رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ آخر آپ ان سفاکوں کے حق میں بددعا کیوں نہیں فرماتے تو آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا، ارشاد ہوا کہ "تم سے پہلے ایسے لوگ گزر چکے ہیں جن کے سر پر آرے چلائے گئے اور جن کے جسم چیر ڈالے گئے مگر وہ اپنے فرض سے باز نہ آئے، خدا اس کام کو پورا کرائے گا"[1]

جبر و تعدی کے ساتھ قریش نے مصالحت اور مفاہمت کی بھی کوششیں جاری رکھیں۔ ان کو خیال ہوا کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دولت و ثروت کی خواہش میں اپنی ایک علٰحدہ جماعت بنانا چاہتے ہیں، اس بنا پر انھوں نے عتبہ بن ربیعہ کے ذریعہ آپکے پاس کہلا بھیجا کہ اگر تم مکہ کی ریاست یا کسی بڑے گھرانے میں شادی یا دولت چاہتے ہو تو ہم اس پر راضی ہیں۔ ہمارے عقائد کی مخالفت چھوڑ دو، اور جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو قوم کے سرداروں نے آپ کو خانہ کعبہ میں گفتگو کے لئے مدعو کیا۔ آپ خوشی خوشی تشریف لے گئے، وہاں قریش نے کہا "محمد! تمہاری وجہ سے ہم جتنی پریشانی میں مبتلا ہو گئے ہیں کوئی قوم اپنے کسی فرد کی بدولت نہ ہوئی ہو گی تم عذاب جان بن گئے ہو، اس سے قبل ہم نے جاہ و دولت کی پیش کش کی مگر وہ تمہیں منظور نہ ہوئی، تم کہتے ہو کہ تمہیں کوئی آسمانی چیز نظر آتی ہے جو تم کو ان نئی باتوں کی تعلیم دیتی ہے یقیناً وہ کوئی

---

[1] صحیح بخاری

جن یا بھوت پلیت ہے۔ کسی نے تم پر جادو یا ٹوٹکا کر دیا ہے ہم سے مفصل بیان کرو تاکہ تمھارے علاج کا انتظام کیا جائے، ہم خود کل مصارف برداشت کرینگے۔"

آنحضرت صلعم نے جواب دیا "تمھاری محبت کا شکریہ، مگر جو کچھ تم نے کہا ہے اسکو میری حالت سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ جو تعلیم مجھے دی جاتی ہے وہ کسی جادو یا ٹوٹکے کے اثر سے نہیں ہے اور نہ کوئی جن ہی مجھ پر غالب آگیا ہے، میں خدا کے فضل سے بالکل تندرست ہوں، میری دعوت کے پیچھے کوئی دنیوی غرض بھی نہیں ہے۔ خدا نے مجھے تمھاری ہدایت کے لئے اپنا نبی بنا کر بھیجا ہے مجھ پر اپنی کتاب اُتاری ہے اور مجھے اپنا بشیر اور نذیر بنایا ہے۔ میرا کام تم تک اپنے رب کا کلام پہنچا دینا ہے۔ اب مانو یا نہ مانو یہ تمھارا فعل ہے۔ اگر مانوگے تو یہ تمھارے لئے دنیا و آخرت کا سرمایہ ہے اور اگر رد کروگے تو میں اللہ کے حکم کا انتظار کروں گا کہ وہ میرے اور تمھارے لئے کیا فیصلہ کرتا ہے۔"

قریش:۔ "اچھا اگر یہی ہے تو ایک بات سنو۔ تم جانتے ہو کہ ہمارے یہاں پانی کی کتنی کمی ہے، زمین بھی ہمارے پاس کم ہے، تم اپنے خدا سے دعا کرو کہ ان پہاڑوں کو یہاں سے ہٹا دے تاکہ ہمارے شہر کا میدان کھل جائے اور یہاں ایسی نہریں جاری کردے جیسی کہ شام اور عراق میں ہیں، نیز ہمارے خاندان کے مُردہ سرداروں کو دوبارہ زندہ کردے تاکہ ہم ان سے دریافت کرسکیں کہ خدا کے یہاں تمھارا کوئی رتبہ بھی ہو یا نہیں؟

پیغمبر صلعم:۔ "میں ان باتوں کے لئے نہیں مبعوث ہوا ہوں، پیغمبروں کا کام ہدایت دینا ہوتا ہے۔"

قریش:۔ "اگر تم ہمارے لئے کچھ نہیں کرسکتے تو نہ سہی۔ خود اپنے لئے خدا سے سوال کرو کہ وہ ایک فرشتہ تم پر تعینات کردے جو تمھارے ساتھ رہا کرے اور تمھاری

نبوت کی تصدیق کیا کرے۔"

پیغمبر صلعم :۔ "میں خدا کے یہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا ہوں"۔

قریش :۔ "تم کہتے ہو کہ تمھارا خدا قادر مطلق ہے اور ہمارے دیوی دیوتا جھوٹے ہیں، پھر تمھارا خدا ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا کیوں نہیں گرا دیتا جو ہم اپنی آنکھوں سے اپنی مخالفت کا انجام دیکھ لیں"۔

پیغمبر صلعم :۔ "خدا بیشک ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔ اب یہ اسکی خوشی کہ کرے یا نہ کرے"۔

قریش :۔ "کیا تمھارے خدا نے تم کو پہلے سے مطلع کر دیا تھا کہ ہم کیا کیا پوچھیں گے اور تم کیا کیا جواب دو گے۔ دیکھو آج ہم نے اپنے عُذر صاف صاف بیان کر دئیے۔ اب ہم قسم کھاتے ہیں کہ اس نئی تعلیم کی اشاعت ہرگز ہرگز نہ ہونے دیں گے۔ یا تم کو ختم کر ڈالیں گے یا خود مر مٹیں گے"۔

گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ ایک شخص نے اٹھ کر کہا "ہم ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں اور کرینگے جو خدا کی بیٹیاں ہیں"۔ ایک دوسرے نے کہا "ہم کو تمھاری باتوں پر ذرا بھی اعتماد نہیں ہے۔ ہم صرف اس وقت قائل ہوں گے جب تمھارا خدا خود ہمارے سامنے آجائے گا"۔ آنحضرتؐ کا پھوپھی زاد بھائی بولا "دیکھو تمھاری قوم نے پہلے کچھ اپنے لئے سوال کئے ان پر تم رضامند نہ ہوئے، پھر اس نے چاہا کہ تم خود اپنی بابت کچھ علامتیں ظاہر کرو اس پر بھی تم تیار نہ ہوئے آخر میں تم سے یہاں تک درخواست کی گئی کہ اس عذاب الٰہی کا تھوڑا سا نمونہ ہی دکھاؤ جس سے تم ہر وقت ڈرایا کرتے ہو۔ وہ بھی تمھیں منظور نہ ہوئی، اب میں تمھاری تقریر سننے کو مطلق تیار نہیں ہوں خواہ تم ہماری آنکھوں

کے سامنے سیڑھی لگا کر آسمان ہی پر کیوں نہ چڑھ جاؤ یا فرشتے تمھاری رسالت کی گواہی کیوں نہ دیں لے

قریش کی روک ٹوک اور ان کے طیش و غضب کے باوجود اسلام کا دائرہ پھیلتا گیا۔ ازدشنوہ کے ضماد اور غفار کے ابوذر جیسے سرداران قبیلہ اور امیر حمزہ اور عمر بن خطاب جیسے سرداران جلیل کا شرف بہ اسلام ہونا ایک طرف مسلمانوں کی تقویت کا باعث ہوا تو دوسری طرف قریش کے قہر نے اور شدت اختیار کر لی۔

یہ صورت دیکھ کر آنحضرت صلعم نے اجازت دیدی کہ صحابہ میں جن کا جی چاہے ترک وطن کر کے حبش چلے جائیں جہاں کے فرمانروا نجاشی کی شریف النفسی اور انصاف پروری کی بڑی شہرت تھی، چنانچہ ۵ نبوی میں گیارہ مرد اور چار عورتوں کا چھوٹا سا قافلہ چھپتا چھپاتا حبش پہنچ گیا، قریش کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے نجاشی اور اسکے ایک ایک درباری کے لیے بیش بہا تحائف لے کر اسکے پاس سفارت بھیجی کہ ہمارے مجرم، جو بھاگ کر آپکے یہاں پناہ گزیں ہو گئے ہیں ان کو ہمارے حوالہ کر دیجئے۔ یہ سفراء نجاشی سے پہلے اس کے دربار کے پادریوں سے ملے اور انکی خدمت میں تحفے پیش کئے اور کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے۔ ہم نے ان کو روکا تو وہ آپکے ملک میں بھاگ آئے ہیں۔ کل ہم بادشاہ کے دربار میں ان کے متعلق درخواست

لے قرآن مجید کی متعدد سورتوں مثلاً بنی اسرائیل، رعد، اعراف، انعام، عنکبوت میں اس مناظرہ کا تذکرہ موجود ہے۔ تفصیل کے لیے رحمۃ للعالمین جلد اوّل ملاحظہ ہو۔

پیش کریں گے۔ آپ ہماری تائید فرمائیں۔ دوسرے روز سفراء دربار میں گئے اور نجاشی سے درخواست کی کہ مسلمان مہاجروں کو ان کے سپرد کر دیا جائے۔ درباریوں نے بھی تائید کی۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا اور پوچھا "تم نے یہ کون سا دین ایجاد کیا ہے جو نصرانیت اور بت پرستی دونوں کے خلاف ہے؟"

مسلمانوں کی طرف سے حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفرؓ نے جواب دیا کہ "اے بادشاہ! ہم ایک جاہل قوم تھے، بت پوجتے تھے۔ نجاست میں گھرے ہوئے تھے، مردار کھاتے تھے۔ بدکاریاں کرتے تھے۔ پڑوسیوں کو ستاتے تھے۔ بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، طاقتور کمزوروں کو کھا جاتے تھے۔ نہ کوئی قاعدہ تھا نہ قانون۔ ایسی حالت میں ہم میں ایک شخص مبعوث ہوا جس کی شرافت، سچائی اور دیانتداری سے ہم پہلے سے واقف تھے۔ اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں ہمسایوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں، گناہوں سے دور رہیں، برائیوں سے بچیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں، ہم اس پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی، اور تمام بُرے اعمال سے باز آئے۔ اس جرم میں ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہوگئی۔ اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ ہم اسی گمراہی میں واپس آجائیں۔ جہانتک ہوسکا ہم نے ان کے مظالم برداشت کئے۔ جب مجبور ہوگئے تو آپ کے ملک میں پناہ لینے چلے آئے ہیں۔"

نجاشی نے کہا "جو کلام الٰہی تمہارے پیغمبر پر اترا ہے کہیں سے پڑھو۔"
حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی چند آیتیں پڑھیں۔ بادشاہ پر ان کا ایسا اثر ہوا کہ اس

کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے کہا "خدا کی قسم! محمدؐ تو وہی رسول ہیں جن کی خبر یسوع مسیح نے دی تھی۔" اسکے بعد اس نے سفرائے قریش سے کہا کہ "تم لوٹ جاؤ۔ میں ان مظلوموں کو ہرگز واپس نہ دونگا۔"

دوسرے روز عمرو بن العاص نے، جو سفارت کے قائد منتخب ہوئے تھے، پھر دربار میں رسائی حاصل کی، اور نجاشی سے کہا کہ "حضور! آپ کو معلوم ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ کے بارہ میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟" نجاشی نے یہ دریافت کرنے کو مسلمانوں کو بلا بھیجا۔ ان لوگوں کو فکر ہوئی کہ اگر حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے کا اقرار کرتے ہیں تو اپنے دین کی تعلیمات سے ہٹتے ہیں اور اگر انکار کرتے ہیں تو نجاشی عیسائی ہے خفا ہو جائے گا۔ مگر حضرت جعفر نے کہا کہ "کچھ بھی ہو، ہم کو سچ بولنا چاہیئے۔"

غرض یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے۔ نجاشی نے پوچھا "تم حضرت عیسیٰ کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہو؟" حضرت جعفر نے جواب دیا کہ "ہمارے پیغمبر نے بتایا ہے کہ عیسیٰؑ خدا کے بندے اور پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہیں۔" نجاشی نے زمین پر سے ایک تنکا اٹھا لیا اور اسے دکھا کر بولا "خدا کی قسم! جو تم نے کہا عیسیٰ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں۔" نصرانی پادری جو دربار میں تھے وہ نہایت برہم ہوئے۔ مگر نجاشی نے انکی پرواہ نہ کی اور قریش کے سفیروں کو بالکل ناکام واپس آنا پڑا۔[1]

مشرکین مکہ نے جب یہ دیکھا کہ حبش تک جانے سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا تو ان کا جذبۂ عداوت اور بڑھا اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آنحضرت صلعم کے سارے خاندان کو

---

[1] زاد المعاد، ج ۱، ص ۲۴۔ مستدرک حاکم، ج ۲، ص ۳۱۰۔

محصور کر کے تباہ کر دیا جائے، محرم ۷ نبوی میں تمام قبائل نے مل کر خاندان ہاشم کی مکمل ناکہ بندی کر دی اور ان سے رشتہ، ناطہ، کھانا پینا، بولنا چالنا، خرید و فروخت، غرض ہر طرح کے تعلقات منقطع کر لیے، ابو طالب مجبور ہو کر اپنے خاندان سمیت مکہ کی ایک گھاٹی شعب ابو طالب میں پناہ گزیں ہو گئے، قریش نے غلہ وغیرہ بند کر دیا، ان لوگوں نے طلح کے پتے کھا کھا کر بسر کی، حضرت سعد کا بیان ہے کہ "ان دنوں ایک بار سوکھا چمڑا ہاتھ آ گیا تھا میں نے اُسے دھو کر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا"۔ نبی صلعم کے عزم میں اس پر بھی کمی نہ آئی۔ حج کے ایام میں (قریش اس مہینہ میں لڑنا حرام سمجھتے تھے) جب مکہ میں باہر کے لوگ آتے تو آپ گھاٹی سے نکل کر تبلیغ فرمایا کرتے۔

تین سال تک بنو ہاشم نے اس حصار میں بسر کی، آخر صبر و استقلال نے فتح پائی اور دشمنوں ہی کو ترس آیا، ہشام عامری جو خاندان ہاشم کا قریبی رشتہ دار تھا اور ان کو چوری چھپے کھانے کا سامان بھیجتا رہتا تھا، زہیر کے پاس 'جو عبد المطلب کے نواسے تھے' گیا اور کہا "کیوں زہیر تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ، پیو اور ہر قسم کا لطف اٹھاؤ اور تمہارے ماموں کو ایک دانہ تک نصیب نہ ہو"۔ بالآخر قریش کے چند سردار ہتھیار باندھ کر بنی ہاشم کے پاس گئے اور ان کو درہ سے نکال لائے۔[۱]

مکہ والوں سے مایوس ہو کر آپ نے شہر سے نکل کر تبلیغ کرنے کا ارادہ کیا اور پیادہ پا طائف تشریف لے گئے وہاں ظالموں نے آپ کے پاؤں پر اتنے پتھر مارے کہ خون جوتوں میں جم گیا زخموں سے چور ہو کر جب آپ بیٹھ جاتے تو وہ ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیتے اور پھر پتھراؤ کرتے، عاجز آ کر آپ نے ایک مکان کے احاطہ میں پناہ لی، بدمعاشوں کا مجمع وہاں بھی پہنچ گیا اور آپ کو اتنا مارا کہ بیہوش ہو کر گر پڑے، حضرت زید ساتھ تھے، انھوں نے آپ کو پیٹھ پر اٹھایا اور

---

[۱] طبقات ابن سعد و سیرۃ النبی جلد اول۔

آبادی کے باہر لے گئے۔ وہاں آپ کو ہوش آیا۔ یہ سب برداشت کرنے کے بعد بھی آپ کو اپنے مقصد میں مطلق کامیابی نہیں ہوئی تھی اور طائف میں ایک شخص بھی مسلمان نہیں ہوا تھا۔ آپ کا دل بھر آیا اور ہاتھ اٹھا کر آپ نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا کہ:۔

"اے اللہ اپنی ناتوانی اور بے بسی اور لوگوں کے ہاتھوں جو میری حقیر ہوئی ہے اسکی میں تجھ سے فریاد کرتا ہوں، تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے ۔۔ درماندوں اور عاجزوں کا مالک ہے میرا مالک تو ہی ہے، تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے؟ بیگانہ اور ترشرو کے سپرد؟ یا اس دشمن کے سپرد جو بہت با اختیار ہے؟ لیکن اگر تو مجھ سے خفا نہیں ہے تو مجھے کسی بات کا ڈر نہیں ہے، مگر تیری عافیت میرے لئے زیادہ کشادہ ہے، میں اس بات سے کہ تیرا غضب یا تیری نارضامندی مجھ پر نازل ہو تیری ذات کے نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے تمام تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا و آخرت کے سبھی کام بن جاتے ہیں، مجھے صرف تیری خوشنودی اور تیری رضامندی درکار ہے، تو ہی میرا سہارا ہے اور تیرا ہی مجھے خوف ہے"[۱]

اور حضرت زید سے آپ نے فرمایا۔ "میں اہل طائف کی بربادی کے لئے کیوں دعا کروں، اگر یہ ایمان نہیں لاتے تو کیا ہوا۔ ان کی آئندہ نسلیں انشاء اللہ خدائے واحد کی عبادت کرنے والی ہوں گی"[۲]

---

[۱] طبری [۲] صحیح مسلم بروایت حضرت عائشہ۔

یہ تو آنحضرت صلعم کا معمول تھا ہی کہ حج کے زمانہ میں جو قبیلے مکہ آتے تھے آپ ان کے پاس جاکر دین کی دعوت دیتے تھے۔ سنہ ۱۱ نبوی میں مدینہ سے آئے ہوئے چھ اشخاص اسلام میں داخل ہوئے اور اس طرح اس مبارک شہر میں اسلام کی کرنیں پہنچنا شروع ہوئیں۔

یہ لوگ اپنے یہاں کے یہودیوں سے سنتے آئے تھے کہ ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے اسلئے انھوں نے نبی صلعم کی باتیں سنتے ہی یہ کہہ کر ایک ساتھ بعیت کر لی کہ "جلدی کرو۔ کہیں یہودی ہم پر سبقت نہ لے جائیں"، دوسرے سال مدینہ منوّرہ کے بارہ اشخاص نے بعیت کی، بعیت کی شرطیں یہ تھیں [1]

(۱) ہم تنہا ایک خدا کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرائینگے۔

(۲) ہم چوری اور زنا نہ کرینگے۔

(۳) ہم اپنی اولاد (یعنی لڑکیوں) کو قتل نہ کرینگے۔

(۴) ہم کسی پر جھوٹی تہمت نہ لگائیں گے، نہ چغلی کھائینگے۔

(۵) ہر اچھی بات میں نبی کی اطاعت کرینگے۔

لوٹتے وقت آنحضرت صلعم نے ان کی تعلیم کے لئے مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ کر دیا، یہ ایک نہایت دولتمند گھرانے کے فرزند تھے، گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے تو آگے پیچھے غلام چلتے تھے، دو سو روپیہ سے کم قیمت کی پوشاک نہیں پہنتے تھے، مگر داخل اسلام ہونے کے بعد ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ بدن پر صرف ایک کمبل ہوتا تھا جسے کانٹوں

---

[1] زاد المعاد

سے انکا لیا کرتے تھے۔

۵

نبوت کے تیرھویں سال اللہ تعالیٰ نے آپ کو ملکوت السموات والارض کی سیر کرائی، یہ بحث اکثر سننے میں آتی ہے کہ معراج جسمانی تھی یا روحانی، بیداری کی چیز تھی یا خواب کی، جمہور کا مذہب یہی ہے کہ جسمانی تھی اور بیداری کی حالت میں واقع ہوئی تھی۔

ہم کو اس سلسلہ میں ابن اسحاق کی یہ بات بہت پسند آئی کہ خدا قادر مطلق ہے وہ اپنے بندہ کو رات کے وقت لے گیا، جس طرح چاہا اور جیسے چاہا تاکہ وہ اسکے پروردگار کی نشانیوں میں سے جو چاہے دکھائے یہاں تک کہ آپنے خدا کی شان اور اسکی قدرت کے عظیم الشان مناظر دیکھے، جو کچھ دیکھے اور اس قدرت کو دیکھا جس سے وہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔[۱]

اسی مافوق الفہم سفر کے موقع پر کائنات کے محافظ نے آپ کو ہجرت کی دعا کا الہام کیا یا حکم دیا۔ اگلے سال مدینہ کے بہتر آدمیوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس موقع پر آپنے ان سے چند سوالات بھی کئے۔

آپنے پوچھا۔ "کیا تم اشاعت دین میں میری مدد کروگے اور اگر میں تمھارے شہر میں آبسوں تو تم میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ اپنے ہی لوگوں جیسا برتاؤ کروگے؟"

جواب میں مدینہ والوں نے دریافت کیا کہ اسکے معاوضہ میں انھیں کیا ملے گا؟

---

[۱] سیرۃ بن ہشام باب الاسراء۔ سیرۃ النبی

آپ نے فرمایا "خدا کی خوشنودی"۔

ان لوگوں نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ! ایسا تو نہ ہو گا کہ جب قوت و اقتدار حاصل ہو جائے تو آپ ہم کو چھوڑ کر اپنے وطن چلے آئیں؟"

آپ نے مسکرا کر فرمایا "نہیں تمھارا خون میرا خون ہے۔ میرا جینا اور مرنا تمھارے ساتھ ہو گا"۔

آپ کے چچا حضرت عباسؓ جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے آپ کے ساتھ تھے۔ انھوں نے انصار سے کہا محمدؐ اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں۔ دشمنوں کے مقابلہ میں ہم ہمیشہ ان کیلئے سینہ سپر رہے۔ اب وہ تمھارے پاس جانا چاہتے ہیں۔ اگر مرتے دم تک ساتھ دے سکو تو ٹھیک ہے ورنہ ابھی جواب دیدو"۔

انصار نے وعدہ کر لیا اور جوش میں آ کر کہا "ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں"۔

یہ سارا واقعہ قریش کا ایک شخص ایک ٹیلہ کی آڑ سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے چیخ کر اپنے قبیلہ کے لوگوں سے کہا "بھائیو! ہمارے خلاف جنگ کے مشورے ہو رہے ہیں"۔ اس پر انصار کو طیش آ گیا اور انھوں نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا۔ "اگر رسول اللہ اجازت دیں تو ہم ابھی ان کو اپنی تلواروں کے جوہر دکھا دیں"۔ لیکن آپ نے اجازت نہ دی۔ آپ نے فرمایا۔ "مجھے جنگ کا حکم نہیں ہے۔ اسکی باتوں کی پرواہ نہ کرو"۔[1]

اسکے بعد نبی صلعم نے صحابہ کو مکہ سے ہجرت کر جانے کی اجازت دیدی۔ قریش نے روک ٹوک تو بہت کی، مگر چوری چھپے رفتہ رفتہ اکثر صحابہ مدینہ چلے گئے۔ اکابر میں صرف

---

[1] طبقات ابن سعد

حضور سرورِ کائنات، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ رہ گئے۔ قریش نے سوچا کہ یہ آپ کو قتل کر ڈالنے کا بہترین موقع ہے اور اس پر غور کرنے کے لئے دار الندوہ میں جو ان کا دار الشوریٰ تھا خفیہ اجلاس کیا۔ تمام قبیلوں کے سرداروں نے اس میں شرکت کی اور مختلف رائیں پیش کیں۔ ایک نے کہا "محمدؐ کے گلے میں طوق اور زنجیر ڈال کر کسی مکان میں قید کر دو تاکہ سسک سسک کر مرجائے۔" دوسرا بولا "یہ مناسب نہ ہوگا۔ محمدؐ کے قید کی خبر چھپ نہ سکے گی۔ سنتے ہی مدینہ والے آکر اسے چھڑا لیجائیں گے۔" ایک اور شخص نے یہ تجویز پیش کی کہ "محمدؐ کو کسی سرکش اونٹ پر بٹھا کر یہاں سے نکال دو۔ کہیں اور جا کر جئے یا مرے، ہماری تو جان چھوٹے۔" اس پر اپنے کو نجدی ظاہر کرنے والے ایک بڈھے شخص نے اعتراض کیا کہ "معلوم ہوتا ہے تم محمدؐ کی دل آویز باتوں کو بھول گئے ہو۔ وہ چند جملے بول کر جسے چاہتا ہے اپنا بنا لیتا ہے۔ وہ جہاں بھی جائے گا اپنے ہمدرد پیدا کرلے گا اور پھر تم سے بدلہ لے گا۔" آخرش ابوجہل کی یہ تجویز سب کو پسند آئی کہ "ہر قبیلہ سے ایک شخص منتخب کیا جائے، اور یہ سب مل کر ایک ساتھ محمدؐ پر حملہ کر دیں۔ اس طرح اس کا خون تمام خاندانوں اور قبیلوں میں بٹ جائے گا اور مسلمان ہمارے کل خاندانوں اور قبیلوں سے بدلہ لینے کی ہمت نہ کرسکیں گے۔"[1]

چنانچہ رات میں ان لوگوں نے آنحضرت صلعم کا مکان گھیر لیا۔ عرب زمانہ جاہلیت میں بھی دوسرے کے گھروں کے زنانہ حصوں میں گھسنا معیوب سمجھتے تھے، اس لئے وہ باہر ٹھہرے رہے کہ صبح جب آپ برآمد ہوں گے تو حملہ کیا جائے گا۔

---

[1] صحیح بخاری، باب الہجرت۔

آنحضرت صلعم کی امانت کا اتنا شہرہ تھا کہ مخالفت اور مخاصمت کے باوجود اکثر اہلِ مکہ آپکے پاس اپنی امانتیں رکھواتے تھے۔ جب آپ کو خطرہ کا احساس ہوا تو آپ نے یہ سب امانتیں تمام بہ نام حضرت علیؓ کے سپرد کیں کہ صبح جاکر انھیں واپس کر آنا۔ پھر سورۂ یسین پڑھتے ہوئے مکان سے باہر تشریف لائے اور رات کے سایہ میں قریش کے حصار سے نکل گئے اور مدینہ روانہ ہو گئے۔ صبح ہونے پر قریش کو خبر ہوئی تو انھوں نے دور دور تک خاک چھان ماری مگر آپ کو نہ پا سکے۔

اکثر مغربی مصنفوں نے ہجرت کے لئے FLIGHT (بمعنی فرار) کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے آپکے میدان چھوڑ کر بھاگ نکلنے کی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ قطعی غلط ہے۔ مکہ سے وقتی طور پر مسلمانوں کا ہٹ جانا ایک دفاعی اقدام تھا تاکہ مدینہ میں اپنا ایک مرکز بنا سکیں جہاں نہ قریش کی عظمت و اقتدار سے ٹکراؤ ہوتا تھا اور نہ خاندانی رقابتیں دین کی راہ میں رخنے ڈالتی تھیں۔ مشہور عالم عیسائی مؤرخ ہٹی نے لکھا ہے کہ ہجرت کا منصوبہ محض مکہ سے بھاگ جانے کے لئے نہیں تھا بلکہ دو برس کے مسلسل غور و خوض کا نتیجہ تھا۔ میجر جنرل اکبر خاں کے نزدیک بھی ہجرت دفاعی سیاست کا ایک نادر نمونہ تھی۔[1]

اور بعد کے واقعات نے تو اس حقیقت کو اتنا نمایاں کر دیا کہ اب کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔

---

[1] حدیثِ دفاع، ص ۱۱۷-۹۷

تیسرا مقالہ

حیاتِ طیبہ (۲)

ہجرت کے بعد

انا فتحنا لک فتحاً مبینا

(ہم نے تم کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔ القرآن، فتح)

مدینہ والوں نے جب سے سنا تھا کہ رسول اللہ صلعم نے مکہ چھوڑ دیا ہے وہ دیدہ و دل فرشِ راہ کئے ہوئے تھے۔ سارا شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا۔ لوگ صبح ہوتے ہی شہر کے باہر جمع ہو جاتے اور دوپہر تک انتظار کرتے رہتے۔ ایک روز وہ انتظار کر کے واپس ہی ہوئے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر اس نے زور سے پکار کر کہا "اہلِ عرب لو، تم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آگیا"۔ یہ سنتے ہی لوگ اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے دوڑ پڑے اور آپ کے گرد جمع ہو گئے۔

مدینہ منورہ سے کوئی تین میل کے فاصلہ پر قبا آباد ہے۔ یہاں انصار کے جو

خاندان رہتے تھے ان میں سب سے زیادہ ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا۔ آنحضرت صلعم یہاں پہونچے تو سارا خاندان خوشی کے مارے تکبیر کے نعرے لگانے لگا۔ آپ نے اسی کی مہمانی قبول فرمائی۔ جو صحابہ پہلے مدینہ آچکے تھے ان میں سے بھی اکثر یہیں قیام پذیر تھے حضرت علیؓ آنحضرت صلعم کے روانہ ہونے کے تین روز بعد مکہ سے چلے تھے۔ وہ بھی پیادہ پا سفر کرتے ہوئے پہونچ گئے اور یہیں ٹھہرے۔

قباء میں آپ کا پہلا کام مسجد کا تعمیر کرانا تھا۔ مسجد کی تعمیر میں دوسرے صحابہ کے ساتھ آپ نے ایک ادنیٰ مزدور کی طرح شرکت فرمائی۔ اپنے ہاتھ سے بھاری پتھر اٹھا کر لاتے۔ ان کے وزن سے اکثر جسم مبارک خم ہوجاتا۔ عقیدت مند آتے اور عرض کرتے۔ "ہمارے ماں باپ آپ پر قربان، آپ چھوڑ دیں، ہم اٹھالیں گے"۔ آپ انکی درخواست قبول فرمالیتے، لیکن فوراً ہی دوسرا پتھر اسی وزن کا اٹھالیتے۔

چند روز قیام فرمانے کے بعد آپ جمعہ کو شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ بنی سالم کے گھروں تک پہونچے تھے کہ نمازِ جمعہ کا وقت آگیا۔ جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی نماز سے پہلے خطبہ دیا۔ یہ اسلام میں سب سے پہلی نمازِ جمعہ اور رسول اللہ صلعم کا سب سے پہلا خطبۂ نماز تھا۔ خطبہ کے چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

"حمد وستائش خدا کے لئے ہے۔ میں اسی کی حمد کرتا ہوں (اور) مدد معافی اور ہدایت اسی سے چاہتا ہوں۔ میرا ایمان اسی پر ہے۔ میں اسکی نافرمانی نہیں کرتا اور نافرمانی کرنے والوں سے عداوت رکھتا ہوں۔ میری شہادت یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ وہ یکتا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں ہو (اور)

محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے ....

"...... جو کوئی خدا کی اطاعت کرتا ہے وہی کامیاب ہے' اور جس نے اس کا حکم نہ مانا وہ راستہ سے بھٹک گیا، درجہ سے گر گیا....

"...... لوگو! جن باتوں سے خدا نے تم کو منع کیا ہے ان سے بچتے رہو۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی نصیحت ہے' اور نہ اس سے بڑھ کر کوئی ذکر.......

"..... مسلمانو! اپنے موجودہ اور آئندہ اور ظاہر اور باطن میں تقویٰ کو پیش نظر رکھو، کیونکہ جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کی برائیاں گھٹا دی جاتی ہیں اور اجر بڑھا دیا جاتا ہے۔ تقویٰ والے ہی وہ ہیں جو بہت بڑی مراد کو پہونچیں گے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو اللہ کی ناخوشی، غصہ اور عذاب کو دور کر دیتا ہے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو چہرہ کو درخشندہ، پروردگار کو خوش اور رتبہ کو بلند کرتا ہے.....

"..... مسلمانو! حظ اٹھاؤ، مگر حقوقِ الٰہی میں فروگذاشت نہ کرو، خدا نے اسی لئے تم کو اپنی کتاب سکھائی ہے اور اپنا راستہ دکھایا ہے کہ سچوں اور جھوٹوں کو الگ الگ کر دیا جائے......"[1]

شہر میں داخلہ کا عجیب و غریب منظر تھا۔ اطلاع ملتے ہی لوگ ہر طرف سے بیتابانہ پیش قدمی کے لئے دوڑے۔ آپ کے ننہیالی رشتہ دار بنو نجار ہتھیار سج سج کر آئے۔ آناً فاناً دو رویہ جاں نثار رو

---

[1] طبری

کی صفیں آراستہ ہو گئیں، راستہ میں انصار کے خاندان ملتے تھے۔ ہر قبیلہ کا سردار سامنے آ کر عرض کرتا کہ "حضور، یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جان ہے" آپ معذرت کرتے، شکریہ ادا فرماتے اور دعائے خیر دیتے۔ شہر قریب آ گیا تو جوش کا یہ عالم ہوا کہ شریف گھرانوں کی عورتیں چھتوں پر نکل آئیں اور خوشی کے گیت گانے لگیں۔

جہاں اب مسجد نبوی ہے اسی کے قریب حضرت ابو ایوب انصاری کا گھر تھا۔ کوکبۂ نبوی یہاں پہونچا تو آپ کو مہمان ٹھہرانے کا اصرار اتنا شدید ہوا کہ بالآخر قرعہ ڈالا گیا اور یہ سعادت ابو ایوب کے مقدر میں آئی۔

حضرت ابو ایوب کا مکان دو منزلہ تھا۔ انھوں نے اوپر کی منزل پیش کی مگر آپ نے ملاقاتیوں کی آسانی کے خیال سے نیچے کا حصہ پسند کیا۔ ابو ایوب دونوں وقت آپ کی خدمت میں کھانا بھیجتے۔ آپ جو چھوڑ دیتے وہ ابو ایوب اور انکی بیوی کے حصہ میں آتا۔ اللہ کے ان خوش نصیب بندوں کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک روز اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا۔ خیال ہوا کہ کہیں پانی بہہ کر نیچے نہ جائے جو رسول اللہ صلعم کو تکلیف ہو۔ گھر میں اوڑھنے کا صرف ایک لحاف تھا حضرت ابو ایوب نے اس کو پانی پر ڈال دیا کہ جذب کر لے۔[1]

یہاں بھی سب سے پہلا کام خانۂ خدا کی تعمیر تھی۔ حضرت ابو ایوب کے مکان کے قریب خاندانِ نجار کی زمین تھی۔ آپ نے اُن کو بلوا کر فرمایا کہ "میں یہ زمین بقیمت لینا چاہتا ہوں" ان لوگوں نے جواب دیا کہ "ہم قیمت تو لیں گے، مگر آپ سے نہیں، خدا سے" زمین کے اصل

---

[1] سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۲۷۹

مالک دو یتیم بچے تھے۔ آپنے ان سے دریافت کیا تو انھوں نے بھی ہدیہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن آپنے گوارا نہ کیا۔ حضرت ابوایوب نے قیمت ادا کی اور مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ اللہ کا رسول پھر مزدوروں کی صف میں تھا۔ صحابہ کرام پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے اور رجز پڑھتے جاتے۔ آپ بھی ان کے ساتھ آواز ملاتے اور فرماتے۔[۱]

اَللّٰھُمَّ لَا خَیْرَ اِلَّا خَیْرُ الْآخِرَۃ — اے خدا! کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے

فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃ — اے خدا! مہاجرین اور انصار کو بخش دے۔

یہ مسجد آرائش و تکلف کی تمام باتوں سے یکسر پاک تھی۔ کچی اینٹوں کی دیواریں، کھجور کے پتوں کی چھت اور کھجور ہی کے ستون۔ فرش بالکل کچا تھا۔ پانی برستا تو کیچڑ ہو جاتا تھا۔ ایک دن صحابہ نماز پڑھنے آئے تو کنکریاں لیتے آئے، اور اپنی اپنی جگہ پر بچھا لیں۔ آنحضرت صلعم کو یہ صورت پسند آئی اور آپنے سنگریزوں کا فرش بنوا دیا۔

مسجد سے متصل ہی آپنے ازواج مطہرات کے لئے مکانات بنوائے۔ یہ مکان چھ چھ سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لانبے تھے۔ چھتیں اتنی نیچی تھیں کہ آدمی کھڑا ہو کر ان کو چھو لیتا تھا۔ دروازوں پر کمبل کا پردہ پڑا رہتا تھا۔ چراغ کبھی نہ جلتا تھا۔[۲]

۲

مسلمانوں میں ایک تو زیادہ تر مفلس و نادار تھے ہی، دوسرے جو ان میں خوشحال بھی تھے وہ مشرکین مکہ سے چھپ کر آنے کی وجہ سے اپنا مال و اسباب ساتھ نہ لا سکے تھے۔ ان کے لیے مستقل انتظام کی ضرورت تھی۔ اگرچہ انصار نے کمال فراخدلی سے اپنے دروازے

---

[۱] سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۲۸۱ [۲] ایضاً، ص ۲۸۷

انکے لئے کھول دیے تھے مگر وہ انکے دسترخوانوں سے منسلک رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مہاجر محنت ومشقّت کے عادی، جفاکش اور خود دار تھے۔ وہ اپنا روزگار شروع کرنا چاہتے تھے، مگر اسکے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے خیال فرمایا کہ "مہاجرین وانصار میں بھائی چارہ کا رشتہ قائم کردیا جائے۔ مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد آپ نے ان دونوں کی ایک مشترکہ مجلس طلب کی۔ مہاجروں کی تعداد اس وقت پنتالیس تھی۔ انکی طرف سے آپ نے انصار کو مخاطب کرکے کہا کہ "یہ تمھارے بھائی ہیں" اور پھر مہاجرین اور انصار میں سے دو دو افراد بلاکر فرمانے گئے "یہ اور تم بھائی بھائی ہو۔"

انصار گویا اسی حکم کے منتظر تھے۔ انھوں نے مہاجروں کو ساتھ لیجاکر گھر کی ایک ایک چیز دکھادی کہ آدھی آپ کی ہے اور آدھی ہماری حتیٰ کہ سعد بن ربیع جو عبدالرحمٰن بن عوف کے بھائی قرار پائے تھے انکی دو بیویاں تھیں، انھوں نے عبدالرحمٰن سے کہا "ایک کو میں طلاق دیئے دیتا ہوں، آپ اس سے نکاح کرلیجئے"۔ لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔

مدینہ والوں کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی تھا، وہاں سرمایہ کے اعتبار سے کھیت ہی سب کچھ سمجھے جاتے تھے۔ انصار نے درخواست کی کہ ان کے کھیتوں کے نصف حصّے ان کے مہاجر بھائیوں کو دیدیے جائیں۔ لیکن چونکہ مکہ معظمہ میں زمین کی خرابی اور پانی کی کمی کی وجہ سے کاشتکاری کا رواج نہیں تھا اور وہاں کے لوگ صرف تجارت اور گلّہ بانی کے پیشوں ہی سے واقف تھے، اسلئے مہاجروں نے معذوری ظاہر کی، اس پر انصار نے کہا کہ اگر ہمارے بھائی کاشتکاری کرنا نہیں جانتے ہیں تو ہم خود کل کام کرکے پیداوار کا آدھا حصّہ ان کو دیدیا کریں گے۔

یہ بھائی بندی کا رشتہ اتنا مستحکم ہو گیا تھا کہ جب کوئی انصاری مرتا تو اس کے ترکہ میں بھی مہاجرین حصّہ پاتے تھے۔ جنگ بدر تک یہی دستور رہا۔ اسکے بعد جب مہاجرین کو مدد کی حاجت نہ رہی تو اسے ختم کر دیا گیا۔

یہ تو انصار کی بے مثال مہمان نوازی اور سیر چشمی کی ایک دھندلی اور نامکمل سی تصویر تھی۔ اب تھوڑا سا تذکرہ مہاجرین کی عالی ظرفی کا بھی ضروری ہے۔

سعد بن ربیع نے جب حضرت عبدالرحمٰن کو زر، زمین، زن، ہر چیز کے نصف کی پیش کش کی تو انھوں نے احسان مندی سے عرض کر دیا کہ "آپ کا مال و متاع آپکو مبارک، مجھے بازار کا راستہ بتا دیجئے"۔ بازار میں انھوں نے کچھ گھی اور پنیر خریدا اور اُسے بیچنے لگے۔ چند دنوں میں انکا کاروبار چل نکلا اور انکی حالت اتنی سُدھر گئی کہ انھوں نے شادی کر لی۔ بعض صحابہ نے دوکانیں کھول لیں، حضرت ابوبکر نے کپڑے کا کارخانہ قائم کیا۔ حضرت عثمان نے کھجوروں کی خرید و فروخت کرنا شروع کر دی۔ حضرت عمر نے ایک منڈی سے دوسری منڈی سامان پہونچانے کا کاروبار کر لیا۔

مدینہ میں مختلف مذاہب کے قبیلے آباد تھے۔ ان میں یہودی سب سے زیادہ طاقتور تھے۔ آنحضرت صلعم نے ہجرت کے پہلے ہی سال میں ان سے ایک معاہدہ کے ذریعہ تعلقات منضبط کر لئے۔ اس معاہدہ کی خاص خاص دفعیں یہ تھیں[۱]۔

(۱) سب لوگ ایک ہی قوم کے فرد سمجھے جائیں گے۔ یہودی مسلمانوں کے ساتھ ایک قوم ہیں۔

---

[۱] سیرت ابن ہشام، جلد ۱

(۲) اگر معاہدہ کرنے والے کسی قبیلہ پر کوئی دشمن حملہ آور ہوگا تو تمام قبیلے ملکر اس کا مقابلہ کرینگے۔

(۳) شریک معاہدہ قبیلوں کے تعلقات خیر خواہی، نفع رسانی اور نیک اطواری پر مبنی ہوں گے نہ کہ جبر پر اور خلاف اخلاق امور میں کوئی اعانت نہیں کی جائے گی۔

(۴) کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا۔

(۵) یہودیوں اور مسلمانوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے۔

(۶) مظلوم کی ہر حال میں مدد کی جائے گی۔

(۷) مدینہ کے اندر کشت و خون حرام ہوگا۔

(۸) معاہدہ کرنے والوں کے درمیان جھگڑے یا فساد کا اندیشہ پیدا ہونے کی صورت میں اسکا فیصلہ خدا اور اسکے رسول پر چھوڑ دیا جائے گا۔

مدینۂ منورہ میں مسلمان مشکل سے دم لینے پائے تھے کہ قریش مکہ نے کہلا بھیجا کہ "مکہ سے بچکر نکل آنے پر زیادہ خوش نہو۔ ہم خود مدینہ آکر تمھارا خاتمہ کیے دیتے ہیں"[۱]

اسکے بعد انھوں نے انصار کو دھمکی دی کہ "تم نے ہمارے آدمی (رسول اللہ صلعم) کو پناہ دی ہے۔ یا تو اسے قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم قسم کھاتے ہیں کہ ہم سب ملکر تم پر حملہ کر دیں گے اور تم کو قتل کر کے تمھاری عورتوں پر قبضہ کرلیں گے"[۲]

جب یہ داؤں نہ چلا تو قریش نے مدینہ کے یہودیوں سے سازباز کی اور مکہ سے مدینہ تک جو قبائل پھیلے تھے ان کو بھی مسلمانوں کے خلاف اُبھارنا چاہا۔

---

[۱] سنن ابی داؤد جلد ۲ [۲] ایضاً

اس آخری شرارت سے مدینہ والے بہت مضطرب ہوئے، کیونکہ قبائلیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ نہایت غیر متمدن، تند خو اور جنگجو تھے۔ وہ جب چاہتے متحد ہو کر مدینہ کا امن غارت کر سکتے تھے۔ آنحضرت صلعم نے اطلاع پاتے ہی انکے پاس سفارتیں روانہ کیں، کچھ کے پاس خود تشریف لے گئے، اور ان میں سے اکثر کے ساتھ دوستی کے معاہدے کر لئے۔

قریش کی زیادتیاں برابر بڑھتی گئیں اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ انکے ایک رئیس نے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کر کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مویشی لوٹ لئے۔ مسلمان اسے مکہ والوں کے باقاعدہ حملہ کا پیش خیمہ سمجھ کر اپنی حفاظت کی تیاریاں کرنے لگے۔ قریش کے تجارتی تعلقات زیادہ تر شام سے تھے اور شام کا راستہ مدینہ کے پاس سے ہو کر گذرتا تھا۔ اس لئے مسلمانوں نے سوچا کہ اگر قریش کے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت بند کر دی جائے تو وہ مجبور ہو کر صلح کر لیں گے، تجارت ہی پر مکہ والوں کی روزی کا انحصار تھا۔ رات کو شہر میں پہرے کا بھی انتظام کیا گیا۔ خود آنحضرت صلعم نے جاگ جاگ کر راتیں بسر کیں اور یہ بھی طے پایا کہ قریش کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھی جائے جس میں وہ اچانک حملہ نہ کرنے پائیں، مکہ کی طرف سو سو پچاس پچاس کی ٹکڑیاں روانہ کی جانے لگیں۔

اس سلسلہ میں آنحضرت صلعم نے عبداللہ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ بطنِ نخلہ کی طرف جو مکہ اور طائف کے درمیان کوئی پندرہ میل پر واقع ہے بھیجا کہ "نخلہ میں قیام کرو اور قریش کے حالات کا پتہ لگا کر اطلاع دو"۔ انھوں نے قریش کے ایک تجارتی قافلہ پر جو شام سے لوٹ رہا تھا، حملہ کر دیا۔ قافلہ کا ایک شخص مارا گیا، دو گرفتار ہوئے اور بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔ حضرت عبداللہ نے مدینہ آکر واقعہ بیان کیا تو آنحضرت صلعم کو سخت ناگوار ہوا اور آپ نے مالِ غنیمت کی چیزیں لینے سے انکار کر دیا۔

صحابۂ کرام نے بھی حضرت عبداللہ پر غصّہ کیا۔[1]

اس جھپٹ کی خبر آگ کی طرح مکّہ پہونچی۔ قریش انتقام کے جنون میں انگاروں پر لوٹنے لگے۔ مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لئے لشکر آراستہ ہونے لگا۔ اس سے نبی صلعم بہت متفکر ہوئے۔ آپنے صحابہ کو جمع کرکے مشورہ کیا۔ مہاجرین نے پر جوش تقریریں کیں۔ جاں نثاری کا یقین دلایا لیکن آپ برابر انصار کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ آپ کی بات سمجھ گئے۔ انکی طرف سے سعد بن عبادہ نے اٹھ کر کہا "کیا حضور کا اشارہ ہماری طرف ہو؟ ہم تو ہر حال میں آپکے ساتھ ہیں۔ ہمارا زر ومال حاضر ہے۔ اور جہاں تک ہماری جانوں کا سوال ہے، خدا کی قسم اگر حضور حکم دیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں"۔ اور مقداد نے کہا "ہم موسیٰ کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جاکر لڑیں، اور ہمیں ہمارے گھروں ہی میں رہنے دیں۔ ہم آپکے داہنے اور بائیں اور آگے اور پیچھے جنگ کرنے کے لئے تیار ہیں"۔[2]

غرض ۱۲ رمضان سنہ ۲ ہجری کو آپ تقریباً تین سو مجاہدوں کے جلو میں مدینہ سے نکلے، لشکر میں صرف دو گھوڑے اور ساٹھ اونٹ تھے۔ قریش کی فوج بڑی شان و شوکت سے آئی تھی۔ ایک ہزار سپاہی تھے، سو سواروں کا رسالہ تھا، سارے رؤسائے قبیلہ ساتھ تھے۔ بدر کے مقام پر دونوں طرف کی فوجوں نے پڑاؤ کیا۔ اتنے میں رات ہوگئی۔ تمام صحابہ نے رات بھر آرام کیا۔ بجز آنحضرت صلعم کی ذات کے جو صبح تک دعا میں مصروف رہی۔ صبح ہوئی تو آپنے لوگوں کو نماز کے لئے پکارا۔ بعد نماز جہاد پر خطبہ دیا۔

---

[1] طبری ص ۱۲۷۵ [2] زاد المعاد ص ۳۳۷

اس سے فارغ ہو کر آپ نے صف آرائی شروع کی۔ دستِ مبارک میں ایک تیر تھا۔ اس کے اشارہ سے صفیں آراستہ کرتے تھے۔ لڑائی میں شور و غل ہوتا ہی رہتا ہے، لیکن آپ نے منع کر دیا کہ کسی کے منھ سے کوئی آواز نہ نکلے۔

آنحضرت صلعم چونکہ اپنے ہاتھ خون سے آلودہ کرنا نہیں پسند کرتے تھے، صحابہ نے آپکے لیے میدان کے کنارے ایک چھوٹا سا سائبان تیار کر دیا تھا۔ صفیں آراستہ کر کے آپ اسی میں تشریف لے آئے۔ اسی اثنا میں دو صحابی، حضرت حذیفہ بن الیمان اور حضرت حُسیل جو کہیں سے آرہے تھے قریش کے روکنے پر عدم شرکت کا وعدہ کر کے آپکے پاس پہونچ گئے اور جنگ میں حصّہ لینے کی اجازت چاہی۔ مسلمانوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ ایک آدمی بھی اگر بڑھ جاتا تو بہت ہوتا۔ لیکن آپنے یہ صورت پسند نہ کی اور فرمایا "ہم حال میں وعدہ وفا کرینگے۔ ہم کو بس خدا کی مدد درکار ہے"۔

نقارۂ جنگ بجا اور قریش کے لشکر نے پیش قدمی کی۔ اب خیر و شر، حق و باطل نور و ظلمت، اسلام و کفر کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل تھیں۔ انسانیت کی تقدیر کے فیصلہ کی آخری گھڑی آپہونچی تھی ـــــ اور یہ فیصلہ صرف چند جانوں پر منحصر تھا۔ آنحضرت صلعم پر ایک الہانہ کیفیت طاری تھی۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتے تھے "اے خدا تو نے جو وعدہ مجھ سے کیا ہے، اسے پورا کر"۔ بیخودی کے عالم میں چادر کاندھوں سے گر گر جاتی اور آپ کو خبر تک نہ ہوتی۔ کبھی بے اختیار ہو کر پیشانی زمین پر رکھ دیتے اور کہتے "خدایا! اگر یہ چند آدمی آج مارے گئے تو پھر دنیا میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا"۔

قریش کی فوجیں اب بالکل قریب آگئیں، پھر بھی آپنے صحابہ کو پیش قدمی سے روکا

اور فرمایا کہ جب دشمن پاس آجائے تو اسے تیر سے روکو۔

بقول علامہ شبلیؒ "یہ معرکہ ایثار اور جانبازی کا سب سے بڑا حیرت انگیز منظر تھا۔ دونوں فوجیں سامنے آئیں تو لوگوں کو نظر آیا کہ خود ان کے جگر کے ٹکڑے تلوار کے سامنے ہیں۔ حضرت ابوبکر کے بیٹے (جو اب تک کافر تھے) میدان جنگ میں بڑھے تو حضرت ابوبکر تلوار کھینچ کر نکلے۔ عتبہ میدان میں آیا تو حضرت حذیفہ (عتبہ کے فرزند) اس کے مقابلہ کو نکلے۔ حضرت عمر کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین تھی۔" [۵]

جنگ کا آغاز یوں ہوا کہ عمرو بن الحضرمی جو تجارتی قافلہ پر حضرت عبدالرحمٰن کے غلطی سے حملہ کر دینے کے نتیجہ میں مارا گیا تھا اس کا بھائی عامر حضرمی آگے بڑھا اور اس نے مسلمانوں کو للکارا۔ مسلمانوں کی طرف سے حضرت عمر کا غلام مہجع اس کے مقابلہ کیلئے نکلا اور مارا گیا۔ کچھ دیر تک اسی طرح فرداً فرداً مقابلہ ہوتا رہا۔ کفار کی طرف سے ایک ایک، دو دو، تین تین آدمی میدان میں اُترتے اور للکارتے۔ مسلمانوں کی فوج سے انکے مقابلہ کو اسی تعداد میں مجاہد جاتے اور جنگ کرتے۔ اس مقابلہ میں مسلمانوں کا پلّا بھاری رہا اور حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت زبیر نے اپنی تلواروں کی نوکوں سے جوشِ ایمانی اور قوت و شجاعت کے نئے باب لکھے جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

اسکے بعد عام حملہ شروع ہوا۔ دونوں لشکر بڑھے اور ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ ابوجہل کی روز افزوں عداوت اور مفسدپن کے باعث انصار میں سے

---

[۵] سیرۃ النبی، ج ۱ صفحات ۳۲۷-۳۱۷

دو بھائیوں، معوذ اور معاذ نے عہد کیا تھا کہ وہ جہاں بھی نظر آئے گا یا اسے ختم کر دینگے، یا خود ختم ہو جائیں گے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا بیان ہے کہ میں صف میں تھا کہ یکایک مجھ کو داہنے بائیں دو نوجوان نظر آئے۔ ایک نے بڑھ کر مجھ سے پوچھا کہ "ابوجہل کہاں ہے؟" میں نے کہا کہ "بھتیجے! ابوجہل کو پوچھ کر کیا کروگے"؟ اس نے جواب دیا کہ "میں نے قسم کھائی ہے کہ ابوجہل کو جہاں دیکھوں گا یا تو اسے مار ڈالوں گا یا خود جان دیدوں گا۔" میں اس سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ دوسرے نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا۔ میں نے اشارہ سے بتایا کہ ابوجہل وہ ہے۔ بس وہ باز کی طرح جھپٹے اور ابوجہل خاک پر تھا۔ وہ نوجوان عفراء کے بیٹے معوذ اور معاذ تھے۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے پیچھے سے آکر معاذ کے بائیں شانہ پر تلوار ماری جس سے بازو کٹ گیا مگر تسمہ باقی لگا رہا۔ معاذ نے عکرمہ کا پیچھا کیا لیکن وہ بچکر نکل گیا۔ معاذ اسی طرح لڑتے رہے۔ ہاتھ کے لٹکے رہنے سے زحمت ہوتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ہاتھ کو پاؤں کے نیچے دبا کر اس زور سے گھسیٹا کہ تسمہ الگ ہو گیا۔ اب وہ آزاد تھے۔

شام ہوتے قریش کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے۔[۱]

اسکے بعد جنگوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو کہیں چار سال بعد ۶ھ میں صلح حدیبیہ کی بدولت سرزمین عرب کو تھوڑا بہت اطمینان میسر آیا۔

۳

مہاجروں کو مکّہ کی یاد اکثر ستایا کرتی تھی۔ وطن کی یاد کسے نہیں ستاتی؟ ان کے بہت سے اعزا اب بھی وہیں رہتے تھے جن کو نہ تو قریش سکون سے بیٹھنے ہی دیتے تھے

[۱] سیرت النبی، جلد اوّل، صفحات ۳۲۷-۳۱۷

اور نہ ہجرت ہی کرنے دیتے تھے۔ اسکے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے تمام عرب خانہ کعبہ کو مقدس سمجھتے آئے تھے اَشْھُرِ حُرُم میں وہ اپنی خانہ جنگیاں بند کرکے مکہ آتے تھے اور مذہبی رسوم ادا کرتے تھے۔ اسلام میں بھی حج فرائض چہارگانہ میں سے ہے۔ ادھر غزوہ خندق میں ناکامی کا منھ دیکھنے کے بعد قریش کے جارحانہ عزائم میں بھی کمی آگئی تھی۔ غرض مختلف اسباب کی بنا پر ذیقعدہ ۶ھ میں مسلمانوں نے مکہ معظمہ جاکر عمرہ کرنے کا ارادہ کیا اور آنحضرت صلعم نے بھی تیاری فرمائی۔

چودہ سو افراد اس سفر کیلئے تیار ہوئے۔ آنحضرت صلعم نے اس خیال سے کہ قریش کو کوئی اور اندیشہ نہ ہو حکم فرمادیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ چلے۔ صرف تلوار کی اجازت تھی جو عرب میں سفر کا ضروری آلہ سمجھی جاتی تھی لیکن وہ بھی اس شرط پر کہ نیام میں بند رہے۔ قریش کو پہلے سے اطلاع بھی کردی گئی کہ ہم لوگ محض مذہبی فرض کی ادائیگی کے لئے آرہے ہیں اور جنگ کا کوئی سامان ہمارے ساتھ نہیں ہے۔

اِدھر یہ قافلہ چلا اُدھر قریش نے قبائل کو جمع کرنا شروع کردیا اور سب کے سامنے قسم کھائی کہ محمدؐ کو مکہ نہ آنے دیں گے۔ مقابلہ کا پورا انتظام کیا گیا۔ اور ابوجہل کا بیٹا عکرمہ دوسو سواروں کا دستہ لے کر آگے بڑھا۔ ان حالات کے پیش نظر آنحضرت صلعم مکہ سے ۱۰۔۱۲ میل قبل حدیبیہ ہی میں ٹھہر گئے اور قریش کے پاس کہلا بھیجا کہ "ہم عمرہ کی غرض سے آئے ہیں۔ لڑنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔ ہم سے جنگ کرکے تم یونہی کافی تباہ ہو چکے ہو۔ بہتر ہوگا کہ ہم لوگ اب صلح کرلیں، ورنہ تمھاری مرضی"۔

مسلمان سفراء مکہ پہونچے تو قریش کے شدت پسند عناصر نے انھیں بولنے تک نہ دیا۔ قریش کے ایک معزز بزرگ عروہ بن مسعود نے بیچ میں پڑکر مصالحت کی صورت

پیدا کرائی۔ وہ خود پیغمبر صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ واپسی پر جو تاثرات اس نے بیان کئے وہ قابل ذکر ہیں۔ اس نے قریش سے کہا "میں نے نجاشی، قیصر اور کسریٰ کے دربار دیکھے ہیں مگر یہ عقیدت اور وابستگی کہیں نہیں دیکھی جو اصحاب محمدؐ کو محمدؐ سے ہے۔ محمدؐ جب بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے۔ حکم دیتے ہیں تو تعمیل کے لیے سب مبادرت کرتے ہیں۔ وضو کرتے ہیں تو جو پانی گرتا ہے اس پر ایک مجمع ٹوٹ پڑتا ہے، اور تھوکتے ہیں تو آب دہن زمین تک نہیں پہونچ پاتا کہ لوگ ہاتھوں میں لے لیتے ہیں اور اپنے چہروں پر ملنے لگتے ہیں .... انکا اتنا رعب ہے کہ کوئی نظر بھر کر ان کی طرف نہیں دیکھ سکتا۔"

عروہ صلح کی گفتگو نا تمام چھوڑ گیا تھا اس لئے آنحضرت صلعم نے حراش بن اُمیہ کو مکہ بھیجا مگر قریش کے کچھ لوگوں نے انھیں راستہ میں گھیر لیا اور ان کا اونٹ مار ڈالا، وہ جان بچا کر حدیبیہ لوٹ آئے۔ تب حضرت عثمان سفیر بنا کر بھیجے گئے۔ قریش نے ان کو نظر بند کر لیا اور کچھ ایسا ہوا کہ ان کے قتل کی افواہ پھیل گئی۔ یہ خبر آنحضرت صلعم کو پہونچی تو آپنے فرمایا کہ عثمان کا قصاص لینا فرض ہے اور ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر آپنے صحابہ سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ مسلمان بے سروسامان تھے، ہتھیار مدینہ ہی میں چھوڑ آئے تھے، لیکن اسکے باوجود ایک ایک شریک سفر نے جس میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، آپکے دست مبارک پر عہد کیا کہ اگر جنگ کی نوبت آئی تو اپنی جانوں سے گزر جائینگے۔

یہ واقعہ اسلام کی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ ہے۔ اسے بیعۃ رضوان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت عثمان کی شہادت کی اطلاع غلط ثابت ہوئی تو صلح کے مذاکرات پھر

شروع ہوئے اور بالآخر سمجھوتہ ہو گیا۔ آنحضرت صلعم خود اُمّی تھے اسلئے آپنے حضرت علیؓ سے صلحنامہ لکھنے کو کہا۔ انھوں نے مسلمانوں کے دستور کے مطابق مسودہ کی پیشانی پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا۔ اس پر قریش کے نمائندہ نے اعتراض کیا کہ ہم نہیں جانتے کہ رحمٰن کسے کہتے ہیں۔ پیغمبر اسلام کے حکم سے یہ عبارت کاٹ دی گئی۔ دوسرا جملہ یہ تھا "یہ معاہدہ محمد رسول اللہ اور قریش کے درمیان ہوتا ہے" قریش اس پر بھی معترض ہوئے۔ انھوں نے کہا "اگر ہم آپ کو خدا کا رسول ہی مان لیں تو پھر جھگڑا کس بات کا رہ جاتا ہے؟ آپ صرف اپنا نام اور ولدیت لکھوائیے" آپنے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ جو قریش کہتے ہیں وہی لکھا جائے۔ حضرت علیؓ وفا شعاری کا پیکر تھے۔ لیکن اس امر کی تعمیل ان سے نہ ہو سکی۔ انھوں نے عرض کیا "میں یہ تحریر ہرگز نہ مٹاؤں گا" آپنے فرمایا "اچھا مجھے بتاؤ کہ میرا نام کہاں لکھا ہے" حضرت علیؓ نے اس جگہ پر انگلی رکھدی اور آپنے ہاتھ میں قلم لیکر "رسول اللہ" کے لفظ پر پھیر دیا۔

معاہدہ کی شرطیں یہ تھیں[1]:-

(۱) مسلمان اس سال واپس چلے جائیں گے لیکن آئندہ سال وہ عمرہ کرنے آئیں گے اور کوئی روک ٹوک نہ ہوگی۔ وہ اپنے ساتھ کوئی ہتھیار نہیں لائیں گے علاوہ تلوار کے جو نیام سے نکالی نہیں جائے گی اور مکہ میں وہ تین دن سے زیادہ قیام نہیں کر سکیں گے۔

(۲) مکہ میں جو مسلمان مقیم ہیں ان میں سے وہ کسی کو اپنے ساتھ نہیں لیجائینگے،

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ۔

لیکن قافلہ کے ساتھ آئے ہوئے مسلمانوں میں سے اگر کوئی مکّہ میں رک جانا پسند کرے تو اسے پیغمبر صلعم کی طرف سے اجازت ہوگی۔

(۳) اگر قریش کا کوئی شخص بھاگ کر مسلمانوں کے پاس پہونچ جائے گا تو واپس کر دیا جائے گا لیکن اگر کوئی مسلمان آکر قریش سے مل جائے گا تو وہ واپس نہ کیا جائیگا۔

(۴) قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ وہ مسلمانوں اور قریشیوں میں سے جن سے چاہیں معاہدہ کرلیں۔

(۵) دس سال تک فریقین میں جنگ بند رہے گی اور تمام جھگڑے فراخدلی کے ساتھ طے کئے جایا کرینگے۔

معاہدہ ابھی لکھا ہی جا رہا تھا کہ ابوجندل جو مکہ میں مسلمان ہو گئے تھے اور اس جرم میں قید کر دیے گئے تھے پاؤں میں بیڑیاں پہنے گرتے پڑتے رسول اللہ صلعم کی خدمت میں پہونچ گئے۔ انھیں دیکھ کر قریش کے نمائندہ نے کہا کہ "معاہدہ کی رو سے انکو ہمارے حوالہ کر دیا جائے۔" آنحضرت صلعم نے اسے سمجھایا کہ جب تک معاہدہ پر دستخط نہ ہو جائیں اس کا نفاذ نہیں ہوتا، لیکن اس نے ضد کی اور کہا کہ "ایسی صورت میں ہمیں صلح ہی منظور نہیں ہے۔" مجبوراً آنحضرت صلعم نے اسکی بات مان لی۔ ابوجندل کو قریش نے اتنا مارا تھا کہ ان کے جسم پر داغ پڑ گئے تھے۔ انھوں نے وہ داغ مسلمانوں کو دکھائے اور کہا کہ "بھائیو! کیا تم پھر مجھے انہی ظالموں کے سپرد کر دو گے؟" صحابہ کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ وہ بہت مضطرب اور رنجیدہ ہوئے۔ مگر بقول ڈاکٹر حمید اللہ مسلمانوں میں ضبط و نظم اتنا پیدا ہو چکا تھا کہ جب ان کے سردار نے ایک بات پر رضامندی دیدی تو انکو خاموشی اور اطاعت شعاری کے سوا کچھ نہ سوجھا۔[۱]

---

[۱] رسول اکرم کی سیاسی زندگی ص ۱۲۴

صلح حدیبیہ جو بظاہر مسلمانوں کے خلاف معلوم ہوتی تھی تدبر اور سیاسی دوراندیشی کا ایسا شاہکار ثابت ہوئی کہ اس پر دستخط ہونے کے دو سال کے مختصر عرصہ کے اندر اسلام مکّہ اور سارے عرب پر غالب آگیا۔ علامہ شبلیؒ نے اسے "اسلام کی تمام آئندہ کامیابیوں کا دیباچہ" قرار دیا ہے۔ امام زہری اسکے مفید نتائج کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آمد و رفت کی بندشیں اٹھ جانے سے مشرکین، تجارت اور دوسرے اغراض سے مدینہ آکر مہینوں قیام کرنے لگے۔ اس طرح ان کو اسلام کو جاننے اور برتنے کا موقع ملا۔ روزمرّہ کی زندگی میں مسلمانوں کی اخلاقی پاکیزگی اور برتری نے ان کے دلوں پر وہ اثر کیا جو برسوں کی جدوجہد نہ کر سکی تھی۔ مسلمان بھی آزادی سے مکّہ جاتے اور اگرچہ اپنی دعوت کی بابت زبان سے کچھ نہ کہتے مگر ان کا عمل سیکڑوں تقریروں اور وعظوں کا کام کرتا اور دین کے منکروں کو دین کی طرف کھینچتا۔ اس سال جتنے لوگ اسلام میں داخل ہوئے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔ قریش کے فخرِ روزگار سپہ سالار خالد بن ولید جن کی آخری لمحہ کی تدبیر نے جنگِ اُحد میں مسلمانوں کے جیتے ہوئے میدان کو پلٹ دیا تھا اسی زمانہ میں مشرّف بہ اسلام ہوئے۔

قریش کی طرف سے اطمینان ہوتے ہی حضور سرورِ کائنات نے اپنی رسالت کے عالمگیر پہلو کی طرف عملی توجہ فرمائی۔ ایک روز آپ نے کُل صحابہ کو جمع کر کے خطبہ دیا کہ "خدا نے مجھ کو تمام دنیا کے لئے رسول اور رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ دیکھو، حضرت عیسیٰ کے حواریوں کی طرح آپس میں اختلاف نہ کرنا۔ جاؤ میری طرف سے پیغامِ حق ادا کرو۔" اسکے بعد آپ نے شاہانِ وقت مثلاً قیصر (روم) خسرو (ایران) مقوقس (مصر) نجاشی (حبش)

منذرین حارث (گورنرشام) ثمامہ (نجد) جبلہ (غسّان) ہوذہ بن علی (یمامہ) جیفر (عمان) وغیرہ کے پاس اپنے مخصوص سفرا کے ذریعہ دینی دعوت نامے روانہ فرمائے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب "رسول اکرم کی سیاسی زندگی" میں ان میں سے بعض مکتوبات کی عکسی تصویریں شائع کی گئی ہیں۔

قیصرِ روم کے پاس مکتوب گرامی لے کر حضرت دحیہ کلبی گئے تھے۔ ان دنوں وہ ایرانیوں پر فتحیابی کا شکرانہ ادا کرنے بیت المقدس آیا ہوا تھا۔ وہیں اس کو خط ملا۔ اس نے خط پاکر حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص مل سکے تو لاؤ۔ اتفاق سے ابوسفیان (جو اس وقت تک کافر اور آنحضرت صلعم کے جانی دشمن تھے) کچھ اور عرب تاجروں کے ساتھ غزّہ میں مقیم تھے۔ قیصر کے آدمی ان کو غزّہ سے جاکر لے آئے۔

قیصر نے خاص دربار منعقد کیا۔ اپنے تخت کے چاروں طرف پادریوں اور راہبوں کی صفیں قائم کیں اور عربوں سے مخاطب ہو کر بولا کہ "تم میں سے کوئی مدعیٔ نبوّت کا رشتہ دار بھی ہے"؟ ابوسفیان نے عرض کیا کہ "میں ہوں" تب قیصر نے دوسرے عرب تاجروں سے کہا کہ دیکھو میں ان سے کچھ سوال کروں گا۔ اگر یہ کسی کا غلط جواب دیں تو مجھے بتا دینا۔ ابوسفیان کا بیان ہے کہ اگر مجھ یہ ڈر نہ ہوتا کہ میرے ساتھی میرا جھوٹ کھول دینگے تو میں خوب باتیں بناتا اور جو جی میں آتا کہتا۔ مگر اس مجبوری میں مجھے سچ سچ ہی کہنا پڑا۔ اسکے بعد قیصر اور ابوسفیان میں یہ گفتگو ہوئی۔

قیصر ـــــ مدعیٔ نبوّت کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان ـ شریف ہے۔

قیصر ـــــ اس کے خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟

ابوسفیان ـ نہیں۔

قیصر ــــ اسکے خاندان میں کوئی بادشاہ گذرا ہے؟

ابوسفیان ـ نہیں۔

قیصر ــــ اسکے پیرووں میں کمزور لوگ زیادہ ہیں یا صاحبِ اثر؟

ابوسفیان ـ کمزور۔

قیصر ــــ اسکے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟

ابوسفیان ـ بڑھ رہے ہیں۔

قیصر ــــ تم لوگوں نے کسی معاملہ میں اسے جھوٹا بھی پایا ہے؟

ابوسفیان ـ نہیں۔

قیصر ــــ کبھی عہد و پیمان کی اس نے خلاف ورزی کی ہے؟

ابوسفیان ـ ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا، لیکن اب جو نیا معاہدہ صلح ہوا ہے
اس میں دیکھیں وہ کیسا رہتا ہے۔

قیصر ــــ تم لوگوں نے کبھی اس سے جنگ بھی کی؟

ابوسفیان ـ ہاں۔

قیصر ــــ نتیجۂ جنگ کیا رہا؟

ابوسفیان ـ کبھی ہماری فتح ہوئی، کبھی اسکی۔

قیصر ــــ وہ کیا سکھاتا ہے؟

ابوسفیان ـ کہتا ہے کہ بس ایک خدا کی عبادت کرو۔ کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔
نماز پڑھو، سچ بولو، پاکدامن رہو، صلۂ رحمی کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے کہا کہ "تم نے اس کو شریف النسب بتایا۔ پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اسکے خاندان میں اس سے پہلے کسی نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا ہے، اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اسی کا اثر ہے۔ تم کہتے ہو کہ اسکے خاندان میں کوئی بادشاہ نہیں گذرا ہے، ورنہ میں خیال کرتا کہ اسکو بھی بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا۔ جو شخص آدمیوں میں جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے اسکی پیروی کی ہے۔ پیغمبروں کے پیرو شروع میں ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ تم مانتے ہو کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے۔ سچے مذاہب کا یہی حال ہوتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں کیا۔ پیغمبر کبھی فریب نہیں کرتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز، تقویٰ اور پرہیزگاری کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو جس جگہ میں بیٹھا ہوں ایک روز وہ اس کے قبضہ میں ہوگی۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے، مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ میں اگر وہاں جا سکتا تو خود اسکے پاؤں دھوتا"۔[۱]

تقریر ختم ہوئی تو قیصر نے حکم دیا کہ رسول اللہ صلعم کا خط دربار میں پڑھ کر سنایا جائے۔ وہ خط یہ تھا:۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ محمدؐ کی طرف سے، جو خدا کا بندہ اور رسول ہے، یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس اعظم ہے۔ اس کو سلامتی ہو جو ہدایت کا پیرو ہے۔ اسکے بعد میں تجھ کو اسلام کی دعوت

---

[۱] صحیح بخاری

دیتا ہوں۔ اسلام لا، تو سلامت رہے گا، خدا تجھ کو دوگنا اجر دیگا۔ اور اگر تو نہ مانا تو اہلِ ملک کا گناہ تیرے اوپر ہوگا۔ اے اہلِ کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے۔ وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا اور کسی کو نہ پوجیں، اور ہم میں سے کوئی کسی کو (خدا کو علاوہ) خدا نہ بنائے۔ اور تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں"۔[۱]

اہل دربار قیصر اور ابو سفیان کی گفتگو سن کر ہی پیچ و تاب کھانے لگے تھے۔ نامۂ مبارک پڑھ کر سنایا گیا تو وہ اور بھی برہم ہوئے۔ ہرقل (قیصر) نے یہ فضا دیکھی تو عربوں کو دربار سے اٹھوا دیا۔ اور جیسا کہ علامہ شبلی نے لکھا ہے "گو کہ اسکے دل میں نورِ اسلام آچکا تھا لیکن تاج و تخت کی تاریکی میں وہ روشنی بجھ کر رہ گئی"۔[۲]

معاہدۂ حدیبیہ نے قبائل کو اختیار دیدیا تھا کہ وہ مسلمانوں یا قریش جن سے چاہیں دوستانہ تعلقات قائم کرلیں۔ چنانچہ بنو خزاعہ مسلمانوں کے شریک ہو گئے تھے۔ ان میں اور بنو بکر میں پرانی عداوت چلی آتی تھی۔ ان کا ہر کام ایک دوسرے کی ضد اور مخالفت میں ہوتا تھا۔ اسلئے بنو بکر نے جواباً قریش سے معاہدہ کرلیا۔

طلوعِ اسلام کے بعد تمام غیر مسلم عربوں کی توجہ کا مرکز مسلمان بن گئے تھے۔ بنو خزاعہ اور بنو بکر کی آپس کی جنگوں میں بھی کمی آگئی تھی لیکن صلح حدیبیہ کے باعث عرب میں کسی قدر امن و سکون جو قائم ہوا تو بنو بکر نے پرانی تاریخ پھر تازہ کرنے کی ٹھانی اور

---

[۱] صحیح بخاری [۲] سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۴۶۷

رؤسائے قریش کی اعانت سے ۸ھ میں بنو خزاعہ پر اچانک حملہ کر دیا خزاعہ نے مجبور ہو کر حرم میں پناہ لی، اور ان کے چالیس ناقہ سوار فریاد لے کر مدینہ پہونچے۔ رسول اللہؐ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے کہ وفدِ خزاعہ کے پیش رو عمرو بن سالم کی دردناک آواز سنائی دی۔

"اے خدا میں محمدؐ کو وہ معاہدہ یاد دلاؤں گا جو ہمارے اور ان کے خاندانوں میں ہوا ہے۔ اے پیغمبر خدا ہماری مدد کر اور خدا کے بندوں کو بلا۔ وہ سب مدد کے لئے جمع ہوں گے۔"

قریش کی اس بد عہدی سے آپ بہت ملول ہوئے۔ تاہم آپنے ضبط فرمایا اور ایک خاص قاصد کے ذریعہ قریش کے پاس یہ تین شرطیں بھیجیں کہ ان میں سے کوئی ایک منظور کر لو۔ (۱) مقتولین کا خونبہا ادا کیا جائے۔ (۲) قریش بنو بکر کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں۔ (۳) معاہدۂ حدیبیہ منقطع کر دیا جائے۔ قریش نے پہلے تو غصہ میں کہدیا کہ انھیں صرف تیسری شرط منظور ہے مگر قاصد کے لوٹنے کے بعد انھوں نے پھر سوچا اور اپنا ایک نمائندہ مدینہ بھیجا کہ صلح حدیبیہ کی تجدید کرلائے مگر قریش کی سابقہ بد عہدیوں، گستاخیوں اور شر انگیزیوں کے پیش نظر آنحضرت صلعم ملتفت نہ ہوئے اور مکہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔

۱۰ رمضان ۸ھ کو دس ہزار مجاہدوں کی جمعیت میں آپنے مدینہ سے کوچ فرمایا۔ راستہ میں کچھ قبائل بھی آکر شریک ہو گئے۔ قریش نے یہ خبر سنی تو تحقیق کے لیے اپنے چند آدمی بھیجے جن میں ابو سفیان بھی تھے۔ ان کو خیمۂ نبوی کے محافظ نے دیکھ لیا اور گرفتار کر کے بارگاہِ رسالت میں پیش کیا۔ ابو سفیان کی

اسلام دشمنی کوئی خفیہ چیز نہ تھی۔ وہ ایک بار رسول اللہ صلعم کے قتل کی سازش بھی کر چکے تھے۔ درحقیقت ان کی ہر شرارت ان کے قتل کی دعویدار تھی۔ مگر عفوِ محمدی جذبۂ انتقام پر غالب آیا۔ آپ نے انھیں معاف کر دیا۔ رحم و رحمت کے اس سلوک کا ابوسفیان پر ایسا اثر پڑا کہ انھوں نے وہیں اسلام قبول کر لیا۔

لشکرِ اسلام مکّہ کی طرف بڑھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت عباس سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو لیجا کر پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا کر دو کہ وہ اپنی آنکھوں سے اللہ کے سپاہیوں کا جلال دیکھ لیں۔ سب سے پہلے غفار کا پرچم نظر آیا۔ پھر دوسرے قبیلوں کے دستے آئے اور تکبیر کے نعرے لگاتے گذر گئے۔ سب کے بعد انصار کا قبیلہ اس ساز و سامان سے آیا کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ابوسفیان نے حیرت سے پوچھا کہ یہ کون لشکر ہے۔ حضرت عباس نے نام بتایا۔ اتنے میں سردارِ فوج حضرت سعد بن عبادہ ہاتھ میں علم لئے برابر سے گذرے اور ابوسفیان کو دیکھ کر پکار اُٹھے۔

الیوم یوم الملحمۃ الیوم تُستحل الکعبۃ۔ (آج گھمسان کا دن ہے۔ آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا (یعنی کعبہ میں خونریزی آج حرام نہ رہے گی۔ آج وہاں خوب خون بہایا جائے گا۔)

سب سے آخر میں کوکبۂ نبوی نور افشانی کرتا ہوا نمودار ہوا۔ ابوسفیان کی نظر چہرۂ مبارک پر پڑی تو آواز بلند کر کے عرض کیا کہ "حضور نے سُنا کہ سعد بن عبادہ ابھی کیا کہتے ہوئے گئے ہیں؟ انھوں نے کہا ہے کہ آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔" ارشاد ہوا کہ "عبادہ نے غلط کہا۔ آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے۔" یہ کہکر حکم دیا کہ فوج کا عَلَم

عبادہ سے لے کر ان کے لڑکے کو دیدیا جائے۔

جب اسلامی افواج مکہ میں داخل ہوئیں تو آپ کے حکم سے اعلان کر دیا گیا کہ:۔

(۱) جو شخص ہتھیار ڈالدے اُسے قتل نہ کیا جائے۔

(۲) جو شخص خانۂ کعبہ یا ابوسفیان یا حکیم بن حزام کے گھروں میں پناہ گزین ہو جائے اُسے امان دیجائے۔

(۳) جو لوگ اپنے گھروں کے دروازے بند کرلیں ان سے جنگ نہ کی جائے۔

(۴) دشمن کے زخمیوں اور اسیروں کو قتل نہ کیا جائے۔

اہل مکہ کی طاقت اتنی ٹوٹ چکی تھی اور وہ مسلمانوں سے ایسا مرعوب ہو چکے تھے کہ ان کی اکثریت نے اوپر کی تین شرطوں میں سے ایک نہ ایک پر عمل کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ باقی نے مقابلہ کیا مگر جلد ہی ۲۸ مقتولین چھوڑ کر بھاگ نکلے اور مکہ فتح ہو گیا۔

رسول اللہ صلعم شہر میں داخل ہوئے تو اس طرح کہ سر جھکا ہوا اور ہونٹوں پر سورۂ فتح کی تلاوت جاری تھی۔ اونٹ پر آپ کے ساتھ آپ کے آزاد کردہ غلام زید کے بیٹے اُسامہ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ سیدھے حرم شریف تشریف لے گئے اور اسے بتوں سے پاک کیا۔ آپ باطل خداؤں کے باطل مجسموں کو لکڑی کی نوک سے ٹھوکے دیتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے:۔

جاء الحق وزھق الباطل وما یبدئ الباطل وما یعید

حق آگیا اور باطل چلا گیا اور اب باطل پھر نہ آئے گا۔

عثمان بن ابی طلحہ خانہ کعبہ کے موروثی کلید بردار تھے۔ آپ نے ان سے کنجی

طلب کی۔ آج انکے لئے عجیب عبرت کا دن تھا۔ آغاز نبوت میں ایک بار آپنے ان سے بیت اللہ کا دروازہ کھولنے کو کہا تھا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس پر آپنے فرمایا تھا "نہ کھولو، مگر ایک دن تم دیکھو گے کہ یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں جسے چاہوں گا دوں گا۔" عثمان جھنجھلا کر بولے تھے۔ "کیا اس دن سارے قریش ناکارہ اور ذلیل ہو جائیں گے؟" آپنے جواب دیا تھا "نہیں اس دن وہ آج سے زیادہ معزز ہوں گے"۔

عثمان خوف وندامت سے عرق عرق ہو رہے تھے، لیکن جبینِ رحمت پر شکن نہ تھی۔ عثمان نے کنجی پیش کی۔ آپ دروازہ کھول کر اندرونِ کعبہ تشریف لے گئے اور دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا فرمائی۔

اس اثناء میں رؤسائے قریش صحن حرم میں جمع ہو گئے تھے، یہ وہی تھے جنکی گردنوں پر بیسوں بے گناہ مسلمانوں کا خون تھا۔ جنھوں نے سیکڑوں مسلمانوں کو سخت سے سخت اذیتیں پہونچائی تھیں اور ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا تھا۔ بارہا مدینہ پر حملہ کیا تھا۔ غرضیکہ اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو برباد کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا:۔

"اے قوم قریش! خدا نے تمھارا جاہلیت کا غرور اور نسلی افتخار توڑ دیا۔ سچ یہ ہے کہ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی۔ خدا فرماتا ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى
وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ
أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ

(لوگو! میں نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے، کہ آپس میں ایک دوسرے پہچان لئے جاؤ۔ لیکن خدا کے نزدیک شریف وہ زیادہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو۔ خدا دانا اور واقف کار ہے۔)

"تمام مفاخر، تمام انتقامات، تمام خونبہا میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ جاؤ تم آزاد ہو اور تم پر آج کوئی مواخذہ نہیں ہے۔"

آپنے کلید حرم عثمان بن ابی طلحہ کو واپس کر دی۔ حضرت عباس نے مشورتاً عرض کیا کہ کنجی ان کے بجائے بنو ہاشم (خاندان نبوی) کو دی جائے۔ مگر آپنے فرمایا۔ "آج تو سلوک کرنے کا دن ہے۔"

پھر رسول اللہ صلعم نے کوہ صفا پر بیٹھ کر اسلام میں داخل ہونے والوں سے بیعت لی۔ حضرت عمر فاروق ایک ایک شخص کو پیش کرتے جاتے تھے اور آپ بیعت لیتے جاتے تھے۔ ہر شخص کو اقرار کرنا پڑتا تھا کہ میں نہ تو ذات میں اور نہ صفات میں خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرونگا، نہ اسکے علاوہ کسی کی عبادت کرونگا اور نہ اسکے سوا کسی سے مدد مانگوں گا۔ چوری، زنا، خونِ ناحق، جھوٹ، بہتان، لڑکیوں کو مار ڈالنے کے رواج سے دور رہونگا، اور ہر سچی اور جائز بات میں اللہ کے رسول کی اطاعت اپنی استطاعت بھر کرونگا۔[۱]

مکہ میں مہاجروں کے مکانوں پر مشرکوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اب انھوں نے

---

[۱] طبری

ان کی واپسی کی درخواست کی، لیکن آپ نے انکو حکم دیا کہ وہ از خود دست بردار ہو جائیں گویا بقول قاضی سلیمان منصور پوری علیہ الرحمتہ آپ کا مدعا یہ تھا کہ "جن چیزوں کو تم خدا کے لئے چھوڑ چکے اب انکی واپسی کا سوال کیوں کرتے ہو؟"[۵۱]

— ۵ —

مکہ قلب عرب تھا اور بیت اللہ کے مجاور ہونے کی حیثیت سے قریش وہاں کی سب سے زیادہ مفتخر قوم تھے۔ اس بنا پر قبائل نے عموماً مسلمانوں اور قریش کے معرکہ ہی کو اسلام کی صداقت کا معیار قرار دے لیا تھا اور کہتے تھے کہ اگر قریش مغلوب ہو گئے اور مکہ فتح ہو گیا تو ہم اسلام قبول کر لیں گے ورنہ نہیں۔ مکہ جب فتح ہو گیا تو انھوں نے خود پیش قدمی کی۔ ان کے سربرآوردہ لوگ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوتے، اپنی نافرمانیوں کی معافی چاہتے، توبہ کرتے، کلمہ پڑھتے اور دین کی باتیں سیکھتے۔ آنحضرت صلعم بہ نفس نفیس انکی تواضع کا اہتمام فرماتے اور حسب ضرورت وظیفے اور اخراجات سفر عنایت فرماتے۔ آپ کو اس کا اتنا خیال تھا کہ آپ کی آخری وقت کی وصیتوں میں ایک وصیت یہ بھی تھی کہ "جس طرح میں وفود کو عطیے دیا کرتا تھا تم بھی دیا کرنا۔"

سنہ ۱۰ھ میں آنحضرت صلعم نے حج کا ارادہ فرمایا اور اسکی اطلاع تمام اطراف میں کرا دی۔ خبر پا کر ہر درجہ اور ہر طبقہ کے لاتعداد لوگ مدینۂ طیبہ میں جمع ہو گئے۔ آپ نے ان سب کو شریک سفر بنا لیا۔ ذوالحلیفہ میں آپ نے احرام باندھا۔ حضرت انسؓ راوی ہیں کہ "میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ہر طرف آدمی ہی آدمی تھے۔ آنحضرت صلعم جب لبیک،

---

[۵۱] رحمۃ للعالمین، جلد ۱، صفحہ ۱۵۹۔

فرماتے تو زائرین بھی آواز ملاتے اور ان کے نعروں سے میدان اور پہاڑ گونج اٹھتے۔"

فتح مکہ کی مہم میں آپ نے جن جن منازل میں نماز ادا فرمائی تھی لوگوں نے وہاں وہاں مسجدیں تعمیر کرلی تھیں۔ آپ ان میں نماز ادا کرتے جاتے۔ ذوالحجہ کی چوتھی تاریخ، اتوار کے دن صبح کے وقت آپ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ خاندان بنی ہاشم کے لڑکے راستے میں جمع ہو گئے تھے۔ آپ اپنے اونٹ پر ان میں سے کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے بٹھا لیتے تھے کعبہ نظر آیا تو آپ نے دعا کی کہ "اے اللہ! تو اس گھر کو اور زیادہ عزت اور عظمت عطا فرما۔" طواف کے بعد آپ نے مقام ابراہیم میں دوگانہ ادا کیا پھر صفا اور مروہ کی پہاڑیوں پر تشریف لے گئے اور کعبہ کی طرف رخ کرکے کلمات توحید و تکبیر ادا فرمائے۔

آٹھویں ذوالحجہ کو مکہ سے روانہ ہو کر منیٰ میں قیام فرمایا اور دوسرے دن طلوع آفتاب کے بعد وادی نمرہ میں تشریف لائے۔ دن ڈھلے عرفات پہونچے۔ سارا میدان شمع نبوت کے پروانوں سے بھرا تھا۔ آپ نے ناقہ ہی پر سے خطبہ دیا۔

"لوگو! میرا خیال ہے کہ ہم تم پھر کبھی اس موقع پر یکجا نہ ہو سکیں گے۔

"تمہارا خون تمہارا مال اور تمہاری جانیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح تم اس دن کی اس مہینہ کی اور اس شہر کی حرمت کرتے ہو۔

عنقریب تم کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بابت دریافت فرمائے گا۔

"خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

"ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں۔

"جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقام خون) باطل کر دئے گئے۔ اور سب سے

پہلے میں اپنے خاندان کا خون (ربیعہ بن الحارث کا خون) باطل قرار دیتا ہوں۔[1]

"جاہلیت کے زمانہ کا سود باطل کر دیا گیا۔ اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا سود (یعنی عباس بن عبد المطلب کا سود) باطل قرار دیتا ہوں۔

"لوگو! اپنی بیویوں کی بابت اللہ سے ڈرتے رہو۔

"نہ تو میرے بعد کوئی پیغمبر ہے اور نہ کوئی نئی امت ہی پیدا ہو گی۔

"لوگو! قیامت کے دن تم سے میری بابت دریافت کیا جائے گا۔ بتاؤ کہ تم کیا جواب دو گے؟"

صحابہ نے عرض کیا۔ "ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کا کلام ہم تک پہونچا دیا، اور حق رسالت ادا کر دیا۔"

آپ نے آسمان کی طرف کلمے کی انگلی اٹھا کر فرمایا۔ "اے اللہ تو گواہ رہ۔"

طبقات ابن سعد میں مذکور ہے، کہ جس کجاوہ پر سے یہ خطبہ دیا گیا تھا اسکی قیمت ایک روپیہ سے زائد نہ تھی!

خطبہ کے اختتام پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ

وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

(آج ہم نے تمہارا مذہب مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام منتخب کر لیا)

---

[1] ربیعہ خاندان ہاشم میں سے تھے۔ ان کو ایک شخص نے قتل کر ڈالا تھا اور ان کے خون کے انتقام لینے کا ایک خاندانی فرض چلا آتا تھا۔

آج زمانہ نے ایک نیا جنم لیا تھا۔ ایک نئی شریعت اور ایک نئی اُمّت وجود میں آئی تھی۔ ارشاد ہوا" زمانہ گھوم پھر کر اسی نقطہ پر آگیا جس پر وہ زمین وآسمان کے خلق ہونے کے دن تھا۔"

— ۶ —

یہ نبی آخر الزماں کا آخری سفر تھا۔ مکہ سے واپسی پر آپ زیادہ تر ذکر وتہلیل میں مصروف رہنے لگے۔ رمضان المبارک میں یوں آپ دس روز کے لئے اعتکاف میں بیٹھتے تھے مگر اس سال آپ بیس دن معتکف رہے تھے۔

جنگِ اُحد کے شہدا کی لاشیں ہل چل اور اضطراب میں نماز جنازہ کے بغیر ہی دفن کر دی گئی تھیں۔ شروع ماہ صفر ۱۱ھ میں ایک روز آپ احد کے گنج شہیداں میں تشریف لے گئے، اور شہدا کے لئے دعا فرمائی اور دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ "اس رقت انگیز طریقے سے ان کو وداع کیا جیسے کہ کوئی مرنے والا اپنے زندہ اعزا کو وداع کرتا ہے [۱]"

اس کے بعد خطبہ دیا جس میں فرمایا:۔

"مجھے اس کا خوف نہیں ہے کہ تم میرے بعد شرک کرنے لگو گے مگر اس سے ضرور ڈرتا ہوں کہ تم دنیا میں نہ مبتلا ہو جاؤ اور اسکی خاطر آپس میں کشت وخون نہ کرنے لگو اور اسی طرح ہلاک نہ ہو جاؤ جس طرح تم سے قبل قومیں ہلاک ہوئیں [۲]"

ایک شب آپنے آسودگان جنت البقیع کو بھی شرف دیدار بخشا اور صبح تک وہیں

---

[۱] صحیح بخاری، باب الجنائز

[۲] ایضاً، باب المغازی

مصروف عبادت رہے۔ یہ عام مسلمانوں کا قبرستان تھا۔

پھر ایک دن مسلمانوں کو جمع کر کے آپ نے ارشاد فرمایا "اللہ تم کو اپنی رحمت میں رکھے۔ تمھاری شکستہ دلی دور فرمائے۔ تم کو رزق دے، تمھاری مدد کرے، تم کو رفعت اور امن و امان نصیب کرے۔

"میں تم کو تقویٰ کی وصیّت کرتا ہوں۔ اور اللہ ہی کو تمھارا اصل نگراں بناتا ہوں اور تم کو اسی سے ڈراتا ہوں کیونکہ میں نذیر و مبین ہوں۔

"دیکھو اللہ کے بندوں کے درمیان تکبر اور برتری نہ اختیار کرنا۔"

پھر چند آیات قرآنی تلاوت فرما کے آپ نے آخر میں فرمایا۔

"سلام تم سب پر اور ان پر جو آئندہ اسلام میں داخل ہوں گے۔"[1]

۲۹ صفر کو آپ ایک نماز جنازہ میں شرکت کر کے واپس آرہے تھے کہ مرض الموت کا حملہ ہوا۔ پہلے سر میں شدید درد ہوا پھر بخار چڑھ آیا جب تک نقل و حرکت کی طاقت رہی آپ مسجد جا کر نماز ادا فرماتے رہے۔ آخری نماز جو آپ نے پڑھائی وہ مغرب کی تھی۔ عشاء کا وقت ہوا تو آپ نے دریافت کیا کہ کیا نماز ہو چکی؟ لوگوں نے عرض کیا کہ حضور کا انتظار ہے۔ آپ نے لگن میں پانی بھروا کر غسل کیا۔ اور مسجد جانا چاہا لیکن غش آگیا۔ طبیعت کچھ بحال ہوئی تو آپ نے پھر ارادہ کیا لیکن پھر غش آگیا۔ اور جب تیسری دفعہ بھی شدت ضعف سے اٹھا نہ گیا تو آپ نے حکم دیا کہ "(حضرت) ابو بکر نماز پڑھائیں"۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا کہ "حضرت ابو بکر (جو ان کے والد تھے) نہایت درجہ رقیق القلب ہیں۔ ان سے آپ کی جگہ

---

[1] رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۳۱۶

کھڑا نہ ہوا جائے گا۔" لیکن آپ نے دوبارہ ان ہی کے متعلق ارشاد فرمایا۔ چنانچہ کئی روز تک حضرت ابو بکر نے نماز پڑھائی۔

دوسرے دن ظہر کے وقت مزاجِ گرامی قدرے سکون پذیر ہوا تو آپ کے حکم سے پانی کی سات مشکیں آپ کے اوپر ڈالی گئیں۔ غسل ہو چکا تو حضرت علی اور حضرت عباس کے سہارے مسجد تشریف لے گئے۔ جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور حضرت ابو بکر نماز پڑھا رہے تھے۔ آپ کی آہٹ پائی تو وہ پیچھے ہٹنے لگے لیکن آپ نے اشارہ سے روک دیا، اور ان کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی، یعنی آپ کو دیکھ کر حضرت ابو بکر نے اور ان کو دیکھ کر باقی اصحاب نے ارکان ادا کئے۔

نماز کے بعد آپ نے ایک مختصر سا خطبہ دیا۔ یہ آپ کا آخری خطبہ تھا۔ آپ نے فرمایا۔[۱]

"خدا نے اپنے ایک بندہ کو اس کا اختیار دیا کہ وہ خواہ دنیا کی نعمتیں قبول کرلے خواہ آخرت میں جو کچھ ہے وہ لے لے، اور اس نے آخرت ہی کی چیزیں قبول کیں۔"

پھر آپ نے فرمایا "میں سب سے زیادہ جس کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں وہ ابو بکر ہیں۔ اگر میں دنیا میں کسی کو اپنی امت میں سے اپنا دوست بنا سکتا تو ابو بکر کو بناتا لیکن اللہ کا رشتہ دوستی کے لئے کافی ہے۔

"تم سے پہلے قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنایا ہے مگر تم ایسا نہ کرنا۔"

---

[۱] صحیح بخاری

اسکے بعد آپنے انصار کی خدمات کا ذکر کیا اور ان کے معاملہ میں وصیت کی کہ "وہ اپنا فرض ادا کر چکے اب تمھیں اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ وہ میرے جسم میں مثل معدہ کے ہیں۔ جو تمھارے نفع و نقصان کا ذمہ دار ہو (یعنی جو خلیفہ مقرر ہو) اسے چاہیئے کہ ان کی نیکیوں کو قبول کرے اور خطاؤں کو معاف کرے۔"

آگے چلکر آپنے اس نکتہ پر زور دیا کہ شرعی احکام آپکے نہیں بلکہ خدا کے صادر کئے ہوئے تھے۔

"حلال و حرام کی نسبت میری طرف نہ کی جائے۔ میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو خدانے اپنی کتاب میں حلال کی ہے اور وہی چیز حرام کی ہے جسے خدانے حرام قرار دیا ہے۔"

آخر میں آپنے یہ نصیحت فرمائی کہ جزا و سزا کا تعلق انسان کے اپنے ذاتی اعمال سے ہے۔ کوئی کسی کو مواخذہ سے نہیں بچا سکتا۔ آپنے فرمایا۔ "اے پیغمبر خدا کی بیٹی فاطمہ! اور اے پیغمبرِ خدا کی پھوپھی صفیہ! خدا کے یہاں کے لئے کچھ کر لو۔ میں تم کو خدا سے نہیں بچا سکتا۔"

رحلت سے ایک دن قبل آپنے اپنے غلام آزاد کر دیئے۔ گھر میں نقد کل سات دینار تھے۔ آپنے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ "وہ دینار کہاں ہیں؟ کیا محمد خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا؟ جاؤ انھیں خیرات کر دو۔" اسلحہ مسلمانوں کو ہبہ کر دیئے۔

شام ہوئی تو حضرت عائشہ کے یہاں چراغ جلانے کو تیل نہ تھا۔ ایک پڑوسن سے قرض تیل منگوایا گیا، تب چراغ جلا۔

دوسری صبح کو فجر کے وقت آپنے وہ پردہ اٹھوایا جو حضرت عائشہ کے حجرہ

اور مسجد نبوی کے درمیان پڑا رہتا تھا، نماز ہو رہی تھی۔ کچھ دیر تک آپ یہ منظر دیکھتے رہے، چہرہ پر بشاشت کی سرخی دوڑ گئی۔ آپ مسکرادیئے پھر پردہ گرادیا گیا۔ اس کے بعد حضور کی زندگی میں کسی دوسری نماز کا وقت نہیں آیا۔

دن جیسے جیسے چڑھتا گیا آپ پر جلد جلد غشی طاری ہونے لگی۔ کچھ دیر بیہوش رہتے، پھر ہوش آجاتا، پھر بیہوش ہو جاتے۔ قریب پانی کی لگن رکھی تھی۔ آپ اس میں بار بار ہاتھ ڈالتے اور چہرے پر ملتے، چہرۂ مبارک کبھی سرخ ہو جاتا کبھی زرد پڑ جاتا۔ کرب کے عالم میں کبھی چادر منھ پر ڈال لیتے، کبھی گرمی سے گھبرا کر الگ کر دیتے۔ حضرت فاطمہؓ تاب ضبط نہ لا سکیں۔ انھوں نے کہا "ہائے میرے باپ کی بے چینی"۔ آپ نے فرمایا "آج کے بعد تمھارا باپ بے چین نہ ہوگا"۔ بار بار یہ کلمات زبان مبارک سے ادا ہوتے لَآ اِلٰہَ اِلَّا، اِنَّ لِلْمَوْتِ سَکَرَاتٍ

اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق کے صاحبزادے عبدالرحمٰن آگئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک تازہ مسواک تھی۔ آپ نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ حضرت عائشہ سمجھیں کہ مسواک کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے دانتوں سے نرم کر کے اُسے دست مبارک میں دیدیا۔ آپ مسواک کر ہی رہے تھے کہ سانس اُکھڑ گئی۔ زبان قدسی پر یہ الفاظ تھے "نماز اور غلاموں کے حقوق"۔ پھر آپ نے آواز قدرے بلند کر کے تین بار فرمایا۔

"یا الرفیق الاعلیٰ" کہتے کہتے آواز رک گئی، ہاتھ لٹک گئے، پتلیاں چھت سے لگ گئیں اور روح قدسی اپنی ابدی آرامگاہ کو پرواز کر گئی۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ

اَفَاِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُوْنَ

عمرِ مبارک قمری حساب سے ۶۳ سال ۴ دن تھی۔

آپ نے ایک بار فرمایا تھا کہ "میرے ورثا کو اشرفیاں بانٹنے کو نہ ملیں گی" یعنی نہ ہونگی اور نہ بانٹیں گے۔ تو یہ بات تو اسی سے عیاں ہے کہ آخری شب چراغ میں ڈالنے کے لئے تیل اُدھار لینا پڑا تھا۔ آلاتِ جبر میں سلطنتِ اسلامیہ کے تاجدار اور ملتِ اسلامیہ کے سپہ سالار کی زرہ تیس صاع جو کے عوض میں ایک یہودی کے پاس رہن تھی۔ باقی آپ نے خود مسلمانوں کو ہبہ فرما دئے تھے۔ ابوداؤد میں حضرت عائشہ صدیقہ کی روایت ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ دینار چھوڑے، نہ درہم، نہ اونٹ، نہ بکری۔"

متروکات میں صرف چند قطعہ زمین اور سواری کے چند جانور تھے۔ سو انکے متعلق بھی آپ اعلان فرما چکے تھے کہ "ہم انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو میں چھوڑوں وہ عام مسلمانوں کا حق ہو۔"

اور یہ ترکہ آپ نے اس وقت چھوڑا جب ملک حجاز کے علاوہ بعض باہر کے علاقے بھی اسلام کے زیرِ نگیں آچکے تھے۔ بڑے بڑے سلاطین اور اُمراء کے یہاں سے آپ کے دربار میں بیش بہا تحائف آتے رہتے تھے اور صحابۂ کرام تو ہر وقت جان و مال سے حاضر رہا ہی کرتے تھے۔

چوتھا مقالہ

معجزے

وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنَاتِ

(اور ہمارے پیغمبر لوگوں کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے۔ القرآن: مائدہ)

معجزے ان مافوق العادت باتوں کو کہتے ہیں جو خدا کے حکم اور اس کی عنایت سے انبیاء علیہم السلام سے صادر ہوتی ہیں۔ قرآن مجید میں بہت سے پیغمبروں کے معجزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور دوسرے مذہبوں کی مقدس کتابوں میں بھی اس قسم کے بے شمار واقعات پائے جاتے ہیں —— اور یہ کچھ انبیاء تک ہی محدود نہیں ہے۔ اللہ کے بعض دوسرے بندے بھی اس کی مرضی اور حکم سے وقتاً فوقتاً اسباب و علل کے کارخانوں پر غالب آتے رہتے ہیں۔

عام اصطلاح میں، جو عجائب و خوارق انبیاء کے ہاتھوں ظاہر ہوتے ہیں

ان کو معجزات اور جو اولیائے کرام سے صادر ہوتے ہیں انکو کرامات کہتے ہیں، مگر حقیقت میں لفظِ "معجزہ" کا یہ استعمال زیادہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ جس مفہوم کا حامل ہے اس سے اسکے خود پیغمبر کا فعل ہونے کی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں غالباً اسی لئے کہیں معجزہ کا لفظ نہیں استعمال کیا گیا ہے اور اسکے بجائے "آیت" (نشانی) اور "برہان" (دلیل) کے الفاظ سے کام لیا گیا ہے۔

معجزہ اور سحر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ سحر ایک ہنر، ایک علم ہے جسے سیکھا اور سکھایا جا سکتا ہے۔ معجزہ کسب و اختیار کی چیز نہیں۔ جس طرح نبوت محض ایک عطیۂ ربانی ہے معجزہ بھی کسی خیالی توجہ و تصرف یا "قوتِ بازو" سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔ سحر طبعی و نفسی اسباب کا نتیجہ ہے۔ معجزہ براہ راست خدا کی مشیت اور قدرت پر منحصر ہے۔ اسکے علاوہ شعبدہ بازی کا مقصد محض تفننِ طبع ہوتا ہے، اور معجزہ سے مقصود نبوت کی تصدیق اور دین کی تبلیغ ہوتی ہے۔ اسلئے ساحروں کا اخلاقی معیار بلند ہونا مطلق ضروری نہیں ہے اور نہ وہ اس کا دعویٰ ہی کرتے ہیں۔

کیا معجزے واقعی ممکن ہیں؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ اگر ممکن نہ ہوتے تو واقع کیونکر ہوتے۔ اور انکے واقع ہونے کی بابت شک کیا جائے تو پھر اس اندازِ فکر کو معجزوں تک ہی کیوں محدود رکھا جائے اور تاریخ کے دوسرے واقعات کیوں مستثنٰی کر دئیے جائیں۔ رہی یہ بات کہ ان واقعات کا ہونا سمجھ میں نہیں آتا تو جو چیز سمجھ میں نہ آتی ہو اسکی واقعیت سے انکار کر بیٹھنا یہ بھی تو تقاضائے عقل نہیں ہے۔ عقلِ انسانی بہرحال کوئی مطلق شے نہیں ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی

فرماتے ہیں کہ:۔

"عالم کی تاریخ آپ کے سامنے ہے جس میں اگر قوموں کے روحانی معلموں کے حالات و سوانح غور سے پڑھیں تو آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا کہ وہ وہ کچھ دیکھتے تھے جو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ وہ، وہ کچھ سنتے تھے جو ہم نہیں سن سکتے۔ وہ، وہ کچھ جانتے تھے جو ہم نہیں جان سکتے اور ان سے وہ اعمال صادر ہوتے تھے جو کسی اور سے نہیں ہو سکتے۔ یہ تاریخی واقعات ہیں جن سے انکار کرنا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح سکندر اور نپولین کے فتوحات اور بدھ اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے وجود سے"[۵۱]

خوارق کی منطقیانہ توجیہ: تعلیل پر بے شمار اوراق سیاہ کئے جا چکے ہیں۔ یونانی فلاسفہ سے لے کر ہیوم (HUME)، ہیگل (HEGEL) ہکسلے (HUXLEY) اور ولیم جیمس (WILLIAM JAMES) تک سبھی مفکروں نے اس بحث میں حصہ لیا ہے۔ جس کا خلاصہ بھی اس مختصر مقالے میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ سیرۃ النبی کی تیسری جلد میں فلسفہ قدیم کے نظریات کی تشفی بخش تشریح کی گئی ہے، اور جدید فلسفہ کے نظریات پر پروفیسر عبدالباری ندوی کا ایک مقالہ بھی اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔ انیسویں صدی کے سب سے زیادہ مشہور ماہر نفسیات ولیم جیمس (WILLIAM JAMES) کی کتاب "ورائٹیز آف ریلیجس ایکسپیرینس" (VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE)

---

۵۱ سیرۃ النبی، جلد سوم، ص ۴۔

بھی اس سلسلہ میں مطالعہ کے لائق ہے۔ معجزوں پر یقین آنے کی پہلی شرط خدا اور غیب پر یقین ہے۔ قدرت خداوندی پر ایمان لائے بغیر معجزوں کی صداقت کا دل نشین ہونا محال ہے اور ایمان لے آنے کے بعد کوئی چیز مانع یقین نہیں رہتی۔

انگلستان کے مشہور منطقی ولیم اسٹانلی جیونس (WILLIAM STANLEY JEVONS) نے ایک نہایت ضخیم کتاب اصول سائنس[1] کے نام سے لکھی ہے جس میں انھوں نے آخری نتیجہ یہ نکالا ہے کہ[2]:

"اوپر علم سائنس کی حقیقت و نوعیت کے متعلق جو بحثیں گذری ہیں اُن سے ایک نتیجہ جو نہایت صاف طور پر نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کارخانۂ فطرت میں مداخلت خداوندی کے امکان کو کسی طرح باطل نہیں ٹھہرا سکتے .... جس قدرت نے کائنات مادی کو خلق کیا وہ میرے نزدیک اس میں حذف و اضافہ بھی کر سکتی ہے۔ اس قسم کے واقعات ایک معنی کر کے، ہمارے لئے ناقابل تصور کہے جا سکتے ہیں، پھر بھی یہ اس سے زیادہ ناقابل تصور نہیں ہیں جتنا کہ خود عالم کا وجود ہے"۔

گویا دوسرے الفاظ میں خالق فطرت خلاف فطرت بھی کر سکتا ہے اور کبھی کبھی اپنی شان کبریائی کا مشاہدہ کرانے کو ایسا کر بھی دیتا ہے۔ یہاں علل و معلولات و اسباب و مسبّبات کے سلسلہ سے انکار کرنا مقصود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عام سنت و عادت یہی ہے کہ مسبّبات اسباب کے تابع ہوں لیکن اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ خود بھی

---

[1] پرنسپلز آف سائنس (PRINCIPLES OF SCIENCE) [2] ماخوذ از سیرۃ النبی جلد سوم ص ۳۰۲

اسباب کی منطق کا پابند ہو گیا ہے۔ سب سے اعلیٰ اور موثّر سبب رَبّ الاسباب کا ارادہ اور امر ہے۔ جیسا کہ مولانا رومؒ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

بیشتر احوال بر سُنّت رود گاہ قدرت خارقِ سُنّت شود

سُنّت و عادت بہادہ با مزہ باز کردہ خرق عادت، معجزہ

بے سبب گر عزّ با موصول نیست قدرت از عزل سبب معزول نیست

اس سلسلہ میں ایک اور نکتہ جس کی طرف مولانا ابو الحسن علی ندوی نے "تاریخِ دعوت وعزیمت" میں اشارہ کیا ہے یہ ہے کہ چونکہ انبیا علیہم السّلام کے زمانہ میں دنیا اسباب ظاہری میں اُلجھی ہوتی ہے اور خالقِ اسباب نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہوتا ہے اور سارا عالم ظواہر اور مظاہر پرستی میں گرفتار ہوتا ہے اس لئے انبیاءعلیہم السّلام اسباب پر ضرب لگاتے ہیں اور اسباب کے بجائے مسبب کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں سے سلسلۂ اسباب کے بالکل خلاف واقعات ظاہر کر کے اور معجزے دکھا کے اسباب کی بے حقیقتی اور کمزوری نمایاں کرتا ہے[۵]۔

انبیاء در قطع اسباب آمدند معجزات خویش بر کیواں زدند

جملہ قرآن است در قطعِ سبب عزِّ درویش و ہلاکِ بولہب

۲

یوں تو انبیاء کا سرتاپا وجود ہی ان کے منصب جلیل کی تصدیق کے لئے کافی ہوتا ہے، لیکن عام طور پر یہ خیال راسخ ہے کہ اخبار بالغیب اور تصرف فی الکائنات

---

[۵] جلد اوّل، صفحہ ۳۶۷

نبوت کے ضروری اجزا ہیں۔ اور نبی وہی شخص ہو سکتا ہے جو خدا کی طرف سے امور غیب کی اطلاع رکھتا ہو اور جس سے خوارق ظاہر ہوتے ہوں۔

چنانچہ اس قدیم عقیدہ کے ماتحت کہ انبیاء کے ساتھ کوئی مافوق الفطرت قوت ضرور ہوتی ہے، معجزے نبوت کی منطقی دلیل نہ سہی نفسیاتی دلیل بلاشبہ ہو جاتے ہیں۔

معجزے بذات خود نہ مقصود ہیں نہ مطلوب۔ انبیاء کا اصلی کام جمادات و نباتات پر تصرف کرنا نہیں، دلوں میں تبدیلی کرنا ہے۔ معجزوں کی حیثیت بس ایک ذریعہ کی ہے کہ وہ لوگوں کے قلوب کو خدا کی طرف موڑنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو انبیاء کی زندگیوں کا ہر باب خود ایک معجزہ نظر آئے گا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام کا قریش کی پیہم سازشوں کے باوجود زندہ وسلامت رہ کر دین کی تبلیغ کرنا، اُمّی ہونے کے باوجود قرآن مجید جیسے لاثانی علمی و ادبی شاہکار کا حامل ہونا، محدود وسائل کے باوجود دشمنوں کے عظیم الشان لشکروں پر میدان جنگ میں فتح پانا اور بالآخر تمام رکاوٹوں اور مخالفتوں پر غالب آکر اشاعت دین میں بے مثال کامیابی حاصل کرنا وغیرہ ـــــ ان میں کون سی بات آپ کی ذات کی معجز نمائی پر دلالت نہیں کرتی۔ مگر ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق سوچتا اور سمجھتا ہے۔ چنانچہ آپ کے اولین مخاطب قریش مکہ کی بڑی تعداد کا یہی حال تھا کہ ان سب چیزوں سے بھی ان کو اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ اور وہ برابر خوارق ہی کے لئے اصرار کرتے رہے۔

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ — اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا کی طرف

آيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ إِنَّمَا — سے اس پر کوئی نشان کیوں نہیں اترتا۔

الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوا إِنِّي — اے پیغمبر کہدے کہ غیب کی بات خدا کے

مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝	پاس ہے، تم اسکے ظہور کا انتظار کرو.
(یونس ع ۲)	میں بھی تمھارے ساتھ منتظر ہوں۔"
وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ	"اور کفار کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر
اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ	اسکے خدا کی طرف سے کوئی نشانی
(الرعد ۴۶)	کیوں نہیں اُترتی۔"
وقالوا لن نؤمن لك	"اور کہا انھوں نے کہ ہم نہ مانیں گے
حتى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْض	تمھاری بات جب تک کہ تم نہ نکالو ہمارے
ينبوعا او تكون لك جنّةٌ	واسطے زمین سے ایک چشمہ، یا ہو جائے
مِنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ	تمھارے واسطے ایک باغ کھجور اور
خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ	انگور کا، پھر جاری کرو تم اس کے بیچ
كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ	میں نہریں، یا گرادو آسمان کو ہمارے اوپر ٹکڑے
تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝	ٹکڑے کرکے جیسا کہ تم کہا کرتے ہو، یا لے آؤ
(بنی اسرائیل ۱۰۶)	اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے ضامن بنا کر۔"

بالآخر جب مشرکین مکہ اپنی ضد سے نہ ہٹے تو اتمام حجت کے لئے پروردگار نے اپنے نبی کے دست حق سے مختلف معجزے رونما کرائے۔

جنوبی ہند میں ایک مثل ہو کہ "سوئے ہوئے کو تو محض تالی بجا کر جگایا جا سکتا ہے، مگر جو بنکر سویا ہوا اُسے تم ڈھول پیٹ کر بھی نہیں چونکا سکتے۔" یہی حال صدور معجزات کے بعد منکرین دین کا ہوا جن کے دلوں میں حق طلبی کا ذرا بھی مادہ تھا ان کی چشم بصیرت روشن ہو گئی، لیکن جو سراسر خود بینی اور خود نمائی کے باعث ہی آپکو

جھٹلاتے تھے اُن کے باطن نے کروٹ تک نہ لی۔

معجزہ طلب کرنے والوں میں پیش پیش اسی آخری قسم کے لوگ تھے جن کے بغض و عناد نے ان کی حق و باطل کی فطری تمیز کو فنا کر دیا تھا۔ اور جن کو بڑی سے بڑی علامت اور نشانی بھی شک و شبہ کے گرداب سے نکال نہیں سکتی تھی۔ وہ کبھی معجزوں کو اتفاقی امور کہتے اور کبھی سحر اور شعبدہ بازی تبلاتے تھے۔ ایک معجزہ انکو دکھایا جاتا تو دوسرے کا تقاضا کرنے لگتے، اور کہتے کہ اس بار تو تشفی نہ ہو سکی، لیکن اگر آئندہ پھر ایسا ہی ہو جائے تو ہم ضرور قائل ہو جائیں گے۔ ان کے جواب میں اللہ پاک اپنے نبی کو نصیحت فرماتا کہ دو چار نہیں ان کے سامنے اگر مسلسل نشانیاں اُترتی رہیں تو بھی ان کی زبانیں بند نہ ہوں گی، اور وہ حق کو نہ مانیں گے۔

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ (الانعام ع ۱)	"اور خدا کی نشانیوں سے کوئی نشانی ان کے پاس نہیں آتی جس سے یہ منھ نہ پھیر لیتے ہوں۔"
وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۔ (الانعام ع ۱)	"اے پیغمبر! اگر ہم تجھ پر ایسی کتاب بھی آسمان سے اتاریں جو اوراق میں لکھی ہو کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو سکیں تو وہ جو کافر ہیں یہی کہیں گے کہ یہ ایک جادو کا کھیل ہے۔"
وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا۔ (الانعام ع ۳)	"اگر وہ لوگ تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں تب بھی وہ ایمان نہ لائیں گے۔"

۳

آنحضرت صلعم کے معجزوں میں سے چند یہ ہیں۔ غلبۂ روم کی پیشین گوئی، بنو نضیر کی سازش کی اطلاع، مہاجرین حبش کو بشارت، ابو سفیان اور عمیر کی آپ کو قتل کرنے کی سازش کی اطلاع، قبائل عرب و قریش کی شکست اور فتح مکہ کی پیشین گوئیاں، فتح بدر و خیبر وحنین کی پیشین گوئی، یہود کی دائمی نامرادی کا اعلان، روم کی قوت ٹوٹ جانے کی اطلاع، خلفائے راشدین کے زمانہ کی لڑائیاں، اپنی وفات کی اطلاع، شرح صدر معراج، شق القمر، شفائے امراض، گونگے کا بولنے لگنا، استجابت دعا، قلیل المقدار اشیاء میں کثیر برکت کا ظاہر ہونا، خالی مشکیزہ سے پانی کا اُبلنے لگنا، آپ کی انگلیوں سے پانی جاری ہوجانا، ناخواندگی کے باعث یہود نصاریٰ کی مذہبی کتابوں سے ناواقف ہونے کے باوجود اُن کے علماء کے سوالات کا صحیح جواب دینا، نزول قرآن ملائکہ سے گفتگو، رویائے صادقہ، ہندوستان میں اسلام پھیلنے کا مژدہ سنانا۔ یہاں نمونہ کی طور پر اطلاع غیب اور صدور خوارق کا ایک ایک واقعہ یعنی اوّل الذکر میں سے غلبۂ روم کی پیشین گوئی اور آخر الذکر میں سے شق القمر کے معجزہ کی کچھ تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

ایک پچھلے مقالہ میں بتایا جاچکا ہے کہ طلوع اسلام کے وقت، روم اور فارس یہی دو دُنیا کی سب سے بڑی طاقتیں تھیں۔ ان میں برابر جنگیں ہوا کرتی تھیں۔ بعثت نبوی کے آٹھویں سال یعنی ۶۱۶ء میں ایرانیوں نے رومیوں کو اتنی زبردست شکست دی کہ انکی طویل وعریض سلطنت کی دھجیاں اُڑگئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رومیوں کا سورج اب ہمیشہ کے لئے غروب ہوجائے گا۔ ان کا اقبال بے شک اپنے انتہائی

نقطۂ زوال کو پہونچ گیا تھا۔

رومی چونکہ مذہباً عیسائی تھے اسلئے مسلمانوں کو ان سے ایک گونہ ہمدردی تھی۔ اور انکی ضد میں مشرکینِ مکہ آتش پرست ایرانیوں کی طرفداری کرتے تھے۔ چنانچہ جب جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کی آرزؤں کے خلاف نکلا تو کفار بہت خوش ہوئے اور انھوں نے مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ "جس طرح ہمارے آتش پرست بھائی تمھارے اہل کتاب رومیوں پر فتح مند ہوئے ہیں اگر تم بھی ہمارے مقابلہ میں آئے تو مغلوب ہوگے"۔

اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کی حالت بڑی حسرت ناک تھی۔ وہ گنتی کے چند آدمی تھے، اور ہر طرف سے حق سے انکار کرنے والی آبادیوں سے گھرے ہوئے تھے کفار ان پر دن رات مشق ستم کیا کرتے تھے، انکا کوئی ہمدرد اور معاون نہ تھا۔ کچھ امید تھی تو رومیوں سے کہ شاید حضرت عیسیٰ کی تعلیم کبھی ان میں اپنا اثر دکھائے اور وہ سچائی اور نیکی کی اس نئی کرن کی حفاظت کے لیے آمادہ ہوجائیں جو سرزمین عرب سے پھوٹی تھی چنانچہ رومیوں کی شکست سے مسلمانوں کو بہت تکلیف پہونچی۔ قریش کی طعنہ زنی نے زخم پر نمک کا کام کیا اور مسلمانوں کی رنجیدہ دلی اور افسردہ خاطری کو اور بھی مکمل کردیا۔

عین اس حالت میں ماضی، حال اور مستقبل کا یکساں علم رکھنے والے نے اپنے نبی کے ذریعہ مسلمانوں کو یہ مژدہ سنایا:۔

غُلِبَتِ الرُّومُ ۙ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ	"قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہوگئے ہیں مگر مغلوب ہونے
وَهُم مِّن بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ	کے چند (تین سے نو) برسوں کے اندر پھر غالب ہوجائیں
فِي بِضْعِ سِنِينَ ۗ لِلَّهِ الْأَمْرُ	گے۔ پہلے اور پیچھے سب اختیار خدا
مِن قَبْلُ وَمِن بَعْدُ ۚ وَيَوْمَئِذٍ	کے ہاتھ میں ہے۔ اس دن مسلمان

یَفرَحُ المؤمِنُونَ ۝ بِنَصرِ اللّٰہ   خدا کی مدد سے خوش ہوں گے "

(الروم ۴۔۱)

پیشین گوئی کوئی بھی ہو اُسے توجہ کا مستحق اسی وقت مانا جائے گا جب وہ قیاس و گمان کے دائرہ کے باہر کی چیز ہو۔ حالات و واقعات اسکے خلاف اشارہ کرتے ہوں، ہر شخص اسے مستبعد سمجھے۔ کسی کو اس پر یقین نہ آئے اور اس سب کے باوجود وہ حقیقت بن کر سامنے آجائے، نہ کہ وہ پیشین گوئی جسے قرآن نے قدرتِ خداوندی اور صداقت نبوی کی ایک نشانی کے طور پر پیش کیا ہو۔ اسلئے یہاں فتح روم کی پیشین گوئی کے تاریخی پس منظر کا تھوڑا سا جائزہ لے لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

سنہ ۶۰۲ء میں فاکس نامی ایک فوجی سردار نے رومی شہنشاہ مارس اور اسکے خاندان کو قتل کر کے خود تختِ شاہی پر قبضہ کر لیا تھا۔ عام دستور کے مطابق نئے شہنشاہ نے اپنی تخت نشینی کی خسرو پرویز فرمانروائے ایران کو اطلاع کی اور اسکے دربار میں اپنا سفیر بھیجا، لیکن خسرو نے نئی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ سفیر کو قید کرا دیا۔ اور سنہ ۶۰۳ء میں روم پر حملہ آور ہو کر آناً فاناً دریائے فرات کو عبور کر کے شام کے شہروں پر قبضہ کر لیا۔

رومیوں کے پاس اعلیٰ فوجی افسروں کی بہت کمی تھی۔ نارسیس ان کا بہترین فوجی قائد تھا، مگر اسے فاکس نے تخت نشین ہوتے ہی قسطنطنیہ کے بازار میں زندہ جلا کر ختم کر دیا تھا۔ فاکس خود ایک معمولی قابلیت کا آدمی تھا۔ چنانچہ ایرانیوں کو روکنے میں رومی ناکام رہے، اور وہ شام کے بعد بازنطینی سلطنت کا مشرقی دارالخلافت انطاکیہ فتح کرتے ہوئے ارض مقدس کے ایک ایک شہر پر قابض ہو گئے۔ یروشلم کے

کلیسے نذرِ آتش کئے گئے۔ مذہبی شعائر کی توہین کی گئی۔ اور یہودیوں کی اعانت سے ساٹھ ہزار بے گناہ عیسائی قتل کر ڈالے گئے۔

یہ قیامت خیز واقعات رونما ہو رہے تھے کہ رومی افریقہ کے گورنر ہرقل نے فاکس کے خلاف بغاوت کی اور سنہ ۶۱۰ء میں اس کو قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔

اِدہر ایرانیوں کا لشکر مصر پر چھا گیا اور حبش و طرابلس کو زیر و زبر کرتا ہوا صحرائے لیبیا کے راستہ سے واپس لوٹا، ایرانی افواج کا دوسرا بازو ایشیائے کوچک کو روندتا ہوا باسفورس کے ساحل پر جا کے رُکا اور شہنشاہ روم کا دارالسلطنت قسطنطنیہ ہر طرف سے اس کی لپیٹ میں آ گیا۔

ایرانی سیلاب جدہر سے ہو کر گزرتا گرجاؤں اور کلیساؤں کو بہالے جاتا۔ ان کی جگہ آتش کدے تعمیر ہو جاتے اور حضرت عیسیٰ کے بجائے آگ اور سورج کی جبری پرستش کے قوانین نافذ کر دیئے جاتے۔

سنہ ۶۱۶ء تک رومی پوری طرح مغلوب ہو گئے تھے، اور علاوہ ان عظیم الشان علاقوں کے جو ان کے ہاتھ سے نکل گئے تھے سلطنت روما کی یوروپین شاخ میں بھی غدر مچا ہوا تھا۔ انگلستان اور فرانس وغیرہ چھٹی صدی کے اختتام ہی پر خود مختاری کا اعلان کر چکے تھے۔ آسٹریا سے لے کر تھریس کی دیواروں تک آوارہ گردوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اور لومبارڈ، گوتھ اور ونڈال کے لگاتار حملے ہو رہے تھے۔

اس ابتری کا ذکر کرتے ہوئے رومیوں کے عظیم المرتبت مورخ ایڈورڈ گبن (EDWARD GIBBON) نے لکھا ہے کہ "رومی سلطنت کی مثال اس

شاندار درخت کی سی تھی جس کے سایہ میں ایک وقت تمام اقوامِ عالم آباد تھیں، مگر اس پر ایسی خزاں آئی کہ برگ و بار کے ساتھ اسکی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہو گئیں اب صرف تنا رہ گیا تھا اور وہ بھی خشک ہو رہا تھا۔ خود پایہ تخت کے اندر غنیم کے گھس آنے کا ایسا خوف تمام آبادی پر چھایا ہوا تھا کہ تقریباً کل کاروبار بند ہو گئے تھے۔ وہ بازار اور تماشہ گاہیں جہاں رات دن چہل پہل رہتی تھی، اب ویران اور سنسان پڑی تھیں۔ اور عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تاہل کے بجائے تجرّد کی زندگی بسر کرتے تھے، تاکہ آزادی اور آسانی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشفی کر سکیں۔"[۵]

خود ہرقل (HERACLIUS) کو شاہد و مینا سے فرصت نہ تھی۔ ان حالات میں قسطنطنیہ ایرانی محاصرہ کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا۔ مجبوراً رومیوں کی طرف سے صلح کی تحریک ہوئی۔ رومتہ الکبریٰ کے زوال کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ جب رومی عہدیدار ایرانی دربار میں امن و عفو کی درخواست لیکر گئے تو خسروئے ایران نے بڑی حقارت سے کہا کہ "مجھ کو یہ نہیں بلکہ خود ہرقل زنجیروں میں بندھا ہوا میرے تخت کے نیچے چاہئیے، میں اس وقت تک صلح نہیں کروں گا جب تک شہنشاہ روم اپنے مصلوب خدا کو چھوڑ کر ہمارے سورج دیوتا کے آگے سر نہ جھکا دے۔"

آخرکار ایرانی سپہ سالار نے صلح کی شرطیں پیش کیں۔ اور کثیر المقدار سونے اور چاندی کے علاوہ ایک ہزار کنواری لڑکیوں کا بھی مطالبہ کیا اور رومیوں نے

---

[۵] ایڈورڈ گبن، جلد ۲، صفحہ ۳۷۲ (GIBBON, OP-CIT, VOL-II P.372)

یہ سب منظور کرلیا۔

درحقیقت اس وقت ایرانیوں کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ اگران کے پاس بحری بیڑہ بھی ہوتا تو وہ آسانی سے پورا یورپ فتح کرسکتے تھے۔

یہ تھی حالت کہ جس میں ۶۱۶ء میں قرآن کی پیشین گوئی نازل ہوئی تھی۔ چنانچہ کفارِ مکہ نے اس کا استقبال خندہ تحقیر سے کیا، اور اسکے خلاف بھاری بھاری شرطیں لگائیں۔[1]

یکبارگی ہرقل کی زندگی میں انقلاب رونما ہوا اور عیش پرستی، کاہلی اور پست حوصلگی کی جگہ جواں ہمتی، بیدار مغزی اور اعلیٰ فوجی صلاحیتوں نے لے لی۔ اس تبدیلی کی بابت گبن نے لکھا ہے کہ "وہ شہنشاہ جو اپنی ابتدائی اور آخری زندگی میں سستی، عیاشی اور اوہام کا غلام اور اپنی رعایا کے مصائب کا نامراد تماشائی تھا جس طرح صبح وشام کا کہر دوپہر کے آفتاب سے پھٹ جاتا ہے، دفعتہً محلوں کا ارکاڈیوس میدان جنگ کا سیزر بن گیا۔[2]

کہاں مصیبتوں اور ناامیدیوں سے گھبرا کر وہ قسطنطنیہ کو خیرباد کہنے کا ارادہ کر رہا تھا، کہاں اس نے سینٹ سوفیا میں جا کے قسم کھائی کہ رومیوں کی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے میں زندگی اور موت کی بازی لگادے گا۔

قسطنطنیہ میں بڑے عزم وانہماک سے جنگی تیاریاں شروع ہوئیں۔ اور ۶۲۱ء میں ہرقل اپنی فوجیں لے کر ایرانیوں سے بدلہ لینے روانہ ہوا۔ جس وقت یہ لشکر قسطنطنیہ

---

[1] جامع ترمذی [2] گبن، جلد ۲۔ صفحہ ۳۰۴

سے نکلا لوگوں نے سمجھا کہ دنیا رومتہ الکبریٰ کا آخری لشکر دیکھ رہی ہے[۱]۔ مگر قرآن کی پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی اور رومیوں نے مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا۔

ہرقل نے ایشائے کوچک کے مغربی، جنوبی ساحل کو بائیں طرف چھوڑتے ہوئے خلیج اسکندرونہ میں اپنی فوجیں آتاریں۔ اور بندرگاہوں کے قلعوں کی مرمت کرائی، پھر وہ سلیشیا میں داخل ہوا اور اسکو فتح کرنے کے بعد کپے ڈوشیا کا رُخ کیا اور اس سے گذرتا ہوا بحرِ اسود اور آرمینیا کے پہاڑوں کو عبور کرتا ہوا قلبِ ایران میں گھس گیا، اور رومی فوجوں کا دوسرا دستہ طورس فتح کرتا اور ایرانیوں کے آتشکدے سَرو اور خسرو کی مورتیں نذرِ آتش کرتا ہوا گندزاکا اور موگان کے علاقوں تک پہنچ گیا۔

ایرانیوں کی سلطنت اس دوطرفہ حملے سے خطرہ میں پڑگئی۔ انھوں نے گھبرا کے وادیٔ نیل اور باسفورس سے فوجیں طلب کیں، مگر ہرقل نے اس لشکرِ جرار کو بھی شکست دی اور قزدین اور اصفہان کے شہروں کو روندتا ہوا کردستان کے پہاڑی سلسلہ کے اوپر سے گذرا اور دجلہ عبور کر کے ایرانیوں سے ایک اور خونیں جنگ لڑی۔ اور ان کو پسپا کر کے ساباط میں داخل ہو گیا۔

آخری اور فیصلہ کن معرکہ نینوا کے میدان میں ہوا جس میں ایرانیوں نے ایسی شکست کھائی کہ انکی سلطنت زیر و زبر ہو گئی، اور رومیوں نے اپنی قدیم تاریخی حدوں سے نکل کر سلطنت فارس کے قلب میں اپنا جھنڈا نصب کر دیا۔

---

[۱] گبن جلد ۲۔ صفحہ ۳۰۴

اس طرح ۶۲۵ء میں یعنی قرآن کی پیشین گوئی کے ٹھیک نو برس بعد ہرقل فاتحانہ قسطنطنیہ واپس آیا۔

گبن نے اس پیشین گوئی پر حیرت ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "محمد (صلعم) نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں پیشین گوئی کی کہ چند سال کے اندر اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہوں گے۔ جب یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات نہیں معلوم ہوتی تھی، کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال سلطنت روما کی عنقریب تباہی اور خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے۔"

اس مہم کی تکمیل کے بعد ہرقل پھر اپنے پرانے مشاغل شراب نوشی اور عیش پرستی کیطرف لوٹ گیا، اور ویسا ہی ہوگیا جیسا کہ وہ اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں تھا۔ تمام مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ اسکی زندگی کا بہترین اور سب سے زیادہ شاندار دور وہ تھا جس میں اس نے ایرانیوں سے بدلہ لیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے صرف اپنی پیشین گوئی کو پورا کرانے کے لئے اسے بیدار کر دیا تھا۔

مورخ ہرقل کی زندگی کا معمہ سلجھانے سے قاصر ہیں اور ان کا فیصلہ ہے کہ ہرقل کے لئے یہ کہیں زیادہ اچھا ہوتا کہ وہ ۶۲۵ء ہی میں مر جاتا۔

انسائکلوپیڈیا بریٹانیکا (ENCYCLO PAEDIA BRITANNICA) کی گیارھویں جلد میں مرقوم ہے کہ:-

"ہرقل کا کردار ایک عجیب معمہ ہے جس کا سلجھانا آسان نہیں ہے، ایک بہادر اور ہوشیار سپہ سالار اور تجربہ کار مُدبّر ہونے کے باوجود وہ نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ

اپنی سلطنت کو پرزے پرزے ہوتے ہوئے دیکھا کیا۔ زندگی کے مختلف دوروں میں اسکی حیثیتیں اور صلاحیتیں نہ صرف ایک دوسرے کے مختلف بلکہ متضاد نظر آتی ہیں۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اسکی خانگی زندگی کے متعلق ہماری معلومات بہت ناقص ہیں، ممکن ہے کہ اس تضاد کا کوئی واقعی سبب ہو اگرچہ اسکے عمل کے لئے وہ صحیح عذر نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسکی شہرت کی بقا کے لئے یہ بہتر ہوتا کہ وہ ایرانی مقابلہ کے فوراً بعد مر جاتا۔"

معجزۂ شق القمر آنحضرت صلعم کی مکی زندگی کے اواخر میں رونما ہوا تھا صحابہ میں سے حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عبد اللہ بن عباس حضرت عبد اللہ بن عمر، انس بن مالک، جبیر بن مطعم وغیرہ نے اس واقعہ کی روایت کی ہے۔

قاضی سلیمان منصور پوری کا بیان ہے کہ آنحضرت صلعم سے چاند کو شق کرنے کا مطالبہ قریش مکہ نے یہود کے مشورہ پر کیا تھا ممکن ہے کہ اس طرف یہودیوں کا خیال حضرت موسیٰ کے سب سے بڑے معجزہ فلق بحر کی وجہ سے گیا ہو۔[1]

حضرت عبد اللہ بن مسعود کا اس واقعہ کا چشم دید بیان جو صحیح بخاری، مسلم وترمذی وغیرہ میں مذکور ہے، یہ ہے:۔

---

[1] رحمۃ للعالمین۔ جلد سوم صفحہ ۱۸۶

"ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں تھے کہ چاند پھٹ گیا اور اس کا ایک ٹکڑا پہاڑ کی طرف چلا گیا۔ آپ نے فرمایا گواہ رہنا"

حضرت انس بن مالک کی یہ روایت بخاری و مسلم دونوں میں ہے کہ:۔

"اہلِ مکہ نے نبی صلعم سے مطالبہ کیا تھا کہ انکو کوئی بڑا معجزہ دکھایا جائے، نبی نے انھیں چاند کا پھٹنا دکھایا۔ اسکے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک ٹکڑا کوہِ حرا کے اُس طرف تھا اور دوسرا اس طرف"

اور جبیر بن مطعم کا بیان ہے کہ اس معجزے کو دیکھ کر قریش نے کہا کہ "محمد نے ہم پر جادو کر دیا ہے۔ اس پر کچھ لوگ بولے کہ اگر محمد نے ہم پر جادو کر دیا ہے تو وہ تمام آدمیوں پر تو جادو نہیں کر سکتے۔ مسافروں کو اور مقامات سے آنے دو۔ دیکھیں وہ کیا کہتے ہیں۔ چنانچہ جب مختلف مقامات سے مسافر آئے تو انھوں نے بھی اپنا یہی مشاہدہ بیان کیا[1]

قرآن مجید میں اس واقعہ کے بارہ میں اجمالاً صرف اتنا فرمایا گیا ہے۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ	"قیامت نزدیک آگئی، اور چاند شق ہو گیا
الْقَمَرُ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً	اگر کافر کوئی بھی نشان دیکھیں تو وہ اس سے
يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ	انکار ہی کرینگے اور کہیں گے کہ یہ تو جادو ہے"

---

[1] جامع ترمذی، تفسیر سورۂ قمر و ابوداؤد۔

مُسْتَمِرٌّ ہ (القمر ع ۱) جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔"

یہ معجزہ ابتدا سے دقیق فلسفیانہ بحثوں کا موضوع رہا ہے۔ قدما کو یہ اعتراض تھا کہ اجرامِ فلکی میں شکست وریخت ناممکن ہے اس لئے چاند کا شق ہونا بھی محال ہے، مگر جدید انکشافات نے فلکیات کے تصوروں میں بہت زیادہ تبدیلی کر دی ہے ___ اور چند صدیوں قبل جو باتیں محال سمجھی جاتی تھیں، آج ان کو سُن کر تعلیم یافتہ دنیا کی جبین پر کوئی شکن نہیں پڑتی ہے۔ ایمونیل ولیکافسکی ___ (IMMANUEL VELIKOVSKY) نے "ورلڈز اِن کولاژن" (WORLDS IN COLLISION) کے نام سے اجرامِ فلکی کے سنن و عادات پر ایک بے نظیر کتاب لکھی ہے۔ جس میں تاریخی حوالوں کے ساتھ بڑے بڑے اجرام کے شکست وریخت و تصادم کے متعدد حادثوں کا ذکر کیا ہے، حتیٰ کہ سورج کے رُخ بدلنے کے کم از کم ایک واقعہ کو بھی عین ممکن بتایا ہے۔

بعض معترضین کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر ایسی عجیب بات واقع ہوتی تو صرف اہلِ مکہ ہی کو نہیں، ساری دنیا کو نظر آتی۔ مگر چاند دنیا کے تمام حصوں میں بیک وقت نظر نہیں آتا ہے۔ قاضی سلیمان منصور پوری نے بڑی محنت سے وقت کا ایک نقشہ تیار کیا ہے جس میں دکھایا ہے کہ اگر عرب میں رات کے ۹ بجے ہوں تو دنیا کے دوسرے ملکوں میں کیا وقت ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندستان برما، ملایا، ترکی، یونان، انگلستان، فرانس، اسپین، پرتگال، امریکا، آسٹریلیا نیوزی لینڈ وغیرہ میں بارہ بجے رات سے لے کر سہ پہر تک کے مختلف اوقات ہوں گے۔ چنانچہ دنیا کا بہت بڑا حصّہ تو اس منظر کو دیکھنے سے قدرتی طور پر معذور تھا۔

اور جہاں طلوع ماہتاب سے لے کر نصف شب تک کا وقت تھا، وہاں اکثر لوگ سو رہے ہوں گے یا اپنے گھروں میں بند ہوں گے۔ اور جنھوں نے دیکھا بھی ہوگا ان میں بہت بڑی تعداد ایسوں کی ہوگی جو ناخواندگی کے باعث اپنے مشاہدات کو تحریری صورت میں لانے کی قدرت نہ رکھتے ہوں گے۔ پھر جو چند پڑھے لکھے تھے بھی ان کے لئے ضروری تو تھا نہیں کہ اس مشاہدہ کو قلمبند کرلیتے، اور اگر دو چار نے اپنی یادداشتوں میں لکھ بھی لیا ہوگا تو ممکن ہے کہ انکی یادداشتیں سیکڑوں دوسرے مسودوں کی طرح ضائع ہوگئی ہوں۔

دنیا میں لاتعداد فلکی انقلابات ظاہر ہوئے ہوں گے لیکن ان میں سے کتنے علم ہیئت کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں؟ تو کیا انکا درج نہ ہونا عدم وقوع کی دلیل ہے؟ مثلاً انجیل میں یہ سطر ملتی ہے کہ "قریب دن بھر کے سورج پچھم کی طرف مائل نہ ہوا"[ا] اور یہودی اور عیسائی دونوں اسکی صحت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اب کیا کوئی ایمان دار شخص محض اس بنا پر اسکو جھٹلا سکتا ہے کہ قدیم کتابوں میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا ہے کہ کرۂ ارض بارہ گھنٹے کے لئے ساکن ہوگیا ہو؟۔

علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ کے نزدیک اس میں ایک پہلو اور بھی ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"چونکہ اللہ نے یہ نشانی محض اہلِ مکہ کے لئے ظاہر کی تھی اسلئے تمام دنیا میں اسکے ظہور و رویت کی حاجت نہ تھی، اور

[ا] کتاب یشوع ۱۰/۱۲

اس بنا پر اگر بالفرض دنیا کے دوسرے حصّوں میں چاند کو شق ہوتے ہوئے نہ دیکھا گیا ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی بلکہ مکہ کے علاوہ دوسرے شہروں اور ملکوں میں اس کا نظر نہ آنا ہی مصلحتِ الٰہی تھی کیونکہ اگر یہ دنیا بھر کے لوگوں کو عام طور سے نظر آتا تو یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ یہ بھی آسمان کے طبعی انقلابات میں سے ایک انقلاب تھا۔ اور عام فلکی تغیرات سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ مگر جب اہل مکہ کے علاوہ جو اور لوگ شہر مکہ میں تھے یا باہر سفر میں تھے صرف ان ہی کو نظر آیا تو اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ یہ صرف آنحضرت صلعم کے ایک نشان کے طور پر ظاہر ہوا تھا۔[۱]

بہرحال، جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں معجزات پر یقین کرنے کی پہلی شرط خدا اور غیب پر یقین ہے۔ اسی کے ساتھ یہ سوال بھی وابستہ ہے کہ اس سارے کارخانۂ فطرت کی بنیاد کوئی بے شعور و بے ارادہ مادّہ ہے یا یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ تمام تر و براہ راست کسی علم و ارادہ والی ذات کی مشیت و قدرت کا ظہور ہے۔ جدید علم الطبیعات (PHYSIES) نے مادّہ کے پرانے نظریہ کو ایک دم غلط ثابت کر دیا ہے۔ اب ازلی و غیر فانی مادہ کے نام کی کوئی چیز تسلیم نہیں کی جاتی ہے جسے انیسویں صدی کی سائنس ایک اٹل حقیقت سمجھتی تھی وہ اب بیسویں صدی کے

---

[۱] سیرت النبی جلد سوم صفحہ ۵۶۷

سائنس دانوں کی نظر میں ایک واہمہ سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔

برقیات کے انکشاف نے مادّہ کی اساسی حقیقت کا قلع قمع کر ڈالا ہے۔ لیکن خود برقیات کی انتہائی حقیقت کیا ہے، یہ کسی کو نہیں معلوم۔ حیرت کی اس منزل پر پہونچ کر کم ازکم سائنسداں فلسفیوں کا رجحان روز بروز لاشعوریت کی جانب بڑھتا جارہا ہے۔ وہ کائنات کا اساسی سرچشمہ شعور کو قرار دینے لگے ہیں۔ گویا کہ مادّی کائنات کی تخلیق و تنظیم کسی بے حس و بے جان شے کے میکانیکی عمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اسکے پیچھے ایک ذہن و شعور ہے۔ اس طرح جب ساری کائنات ہی ایک ذی علم و ذی شعور اساسی سرچشمہ سے ماخوذ ہے تو معجزوں کی مادّی و میکانکی تشریح کی خواہش دراصل ایک جاہلانہ خواہش ہے۔ خود مادّہ کو غیر مادّی و غیر جوہری تسلیم کرلینے کے بعد بھی مادہ پرست ذہنیت کا تسکا درہنا اور اسکی بناپر خدا اور مذہب اور نبوت کا انکار کرنا کونسی عقلمندی ہے؟۔

پانچواں مقالہ

خُلقِ عظیم

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ

(بے شک تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو)

انسان معاشرہ میں پیدا ہوتا ہے اور اسی میں جیتا اور مرتا ہے۔ ارسطو نے اسے ایک "معاشرتی جانور" کہا ہے۔ ماں کے آغوش سے لیکر لحد کے آغوش تک اس کی زندگی معاشرہ کے مختلف علاقوں اور رابطوں میں جکڑی ہوئی ہے ان علاقوں اور رابطوں کی اسے ہر وقت ضرورت ہے۔ یہ اس کی بشریت کے اجزا ہیں ان کو توڑ کر وہ ایک انسان کی طرح زندگی نہیں بسر کر سکتا ہے۔ ارسطو ہی کا قول ہے کہ "جسے معاشرہ کی حاجت نہ ہو وہ یا خدا ہے یا درندہ، انسان نہیں"

ہماری اس خصوصیت نے ہمارے وجود کے گرد حقوق و فرائض کا ایک

وسیع جال بن دیا ہے۔ ہم پر ہمارے گھر کے حقوق ہیں، ہمارے محلہ کے حقوق ہیں، ہمارے شہر، ہمارے ملک اور کل دنیا کے حقوق ہیں اور ان سب پر ہمارا حق ہے، جو شخص ان حقوق اور ذمہ داریوں کو برتنے میں جتنا زیادہ کامیاب ہو اسے اتنا ہی زیادہ شریف شائستہ اور معیاری شہری سمجھا جاتا ہے۔

ایک فرد اور دوسرے فرد یا افراد اور معاشرہ کے رشتوں اور تعلقات کے عدل و انصاف اور ہمدردی اور سلامتی کی بنیادوں پر رکھنے کے لئے دو چیزیں ہیں۔ قانون اور اخلاق، ہماری نجی اور اجتماعی زندگی کی عافیت اور اس کے صاف ستھرے پن کا انحصار انھیں پر ہے۔

دنیا کے سارے مذہبوں نے اپنی بنیاد اخلاق پر رکھی ہے، اسلام نے تو ایک طور پر اخلاق کی اہمیت کو عبادت سے بھی بڑھا دیا ہے، اور جب کہ کفر و شرک کے علاوہ ہر گناہ کو خدا کے نزدیک معافی کے قابل قرار دیا ہے، باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی کی معافی ان بندوں کے ہاتھ میں رکھی ہے جن کے حق میں وہ ظلم ہوا ہو۔

اسلام اخلاق حسنہ کو ایمان کی پہچان اور اسکے نتائج و ثمرات بتاتا ہے۔ جن مسلمانوں کے اخلاق جتنے اچھے ہوں اتنا ہی اس کا ایمان مضبوط اور اسکی عبادت مقبول ہوگی لیکن اگر کوئی شخص ایمان کا تو دعویدار ہو اور خدا کی عبادت کا بھی اہتمام رکھتا ہو مگر اخلاق کی دولت سے محروم ہو اور اہل و عیال، اعزاء و اقربا دوست و احباب، پڑوسی، اہل وطن اور ساری انسانی برادری حتیٰ کہ جانوروں تک سے جو اس کا تعلق ہے اسے بحسن و خوبی انجام نہ دیتا ہو تو یہ عملی ثبوت اس بات کا ہوگا کہ اس

کا ایمان، اس کی زبان سے اتر کر اس کے نفس کی گہرائیوں تک نہیں پہونچا ہے گو یا کہ ہمارے اخلاق، ہماری ایمانی حالت کی کسوٹی ہیں - ہم اپنے اخلاق کے آئینہ میں اپنی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں اس طرح کے مضامین بکثرت آئے ہیں۔

"مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو۔"

"اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا بندہ وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں"

"لوگوں کو قدرت الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئی ہیں ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں۔"

"تم میں میرے سب سے پیارے اور مجھ سے سب سے قریب وہ ہیں جو تم میں خوش خلق ہیں، اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بد اخلاق ہوں۔"

"جس کی نماز اس کو برائی اور بدی سے باز نہ رکھے اس کی نماز نماز ہی نہیں۔"

"میں حسن اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔"

"اچھے خلق ہی کو اسلام کہتے ہیں۔"

حسن اخلاق کے پایہ اور مرتبہ کا اندازہ اوپر کی ان احادیث سے ہوگیا ہوگا ——— اچھے اخلاق ایمان کے لوازم ہی نہیں بلکہ وہ انسان کو ان بلندیوں تک بھی پہونچا دیتے ہیں جن تک وہ کثرت عبادت کے ذریعہ پہونچ سکتا ہے۔ ارشاد نبویؐ ہے۔

"انسان حسن خلق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر نماز پڑھنے سے ملتا ہے۔"

"قیامت کے ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری اور چیز نہ ہوگی۔"

"اچھے اخلاق والا دنیا اور آخرت کی نیکیاں لے گیا۔"

آنحضرت صلعم کے عہد مبارک میں دو صحابی بیویاں تھیں۔ ایک دن بھر روزہ رکھتیں اور رات بھر عبادت کرتیں صدقہ دیتیں، مگر زبان دراز ایسی تھیں کہ پڑوسیوں کے دل چھلنی کئے رہتیں۔ دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو کپڑے بانٹ دیا کرتیں مگر ایذا ان سے کسی کو نہ پہونچتی، حضورؐ سے ان دونوں کی بابت پوچھا گیا تو آپ نے پہلی کی بابت فرمایا کہ اس میں کوئی نیکی نہیں، وہ اپنی بدخلقی کی سزا بھگتے گی اور دوسری کی بابت فرمایا کہ وہ جنتی ہوگی۔

اسلام کی دوسری تعلیمات کی طرح اس کی اخلاقی تعلیم بھی حیرت انگیز طریقہ پر جامع اور مکمل ہے، اور دوسری صفت اس کی یہ ہے کہ اسلام نے اخلاق حسنہ کی غرض وغایت تمام تر خدا کی خوشنودی ٹھہرائی ہے۔ اس طرح اچھے اور پاکیزہ اخلاقی خصائل و افعال کی نوعیت بھی عبادت کی ہوجاتی ہے اور وہ ہر قسم کی

دنیوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک اور بلند ہو جاتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اچھے اور برے کاموں کا مدار نیت یعنی قلبی ارادہ یا کیفیت پر ہے۔ نیتجہ اتنی اہم چیز ہنیں ہے۔ ذاتی نفع، ریاکاری، نمائش، فخر، لالچ، خوشامد اور اس قبیل کے دوسرے محرکات اگر کسی بظاہر اچھے سے اچھے کام کے پیچھے ہوں تو اس میں کوئی خوبی نہ رہے گی۔ نہ اللہ کی نظر میں اور نہ ہماری آپ کی نظروں میں —— اور اللہ کی نظر میں تو نیکی کے وہ کام بھی جو انسان اپنے ضمیر کی تسکین یا روحانی مسرت یا وجدان یا افادۂ عام کی غرض سے انجام دے اور اسکے حکم کی حیثیت اور آخرت کے اجر و ثواب کی نیت اس میں ملحوظ نہ رکھے بے وقعت اور بے قیمت ہی رہیں گے۔

انسانی فطرت کی رنگا رنگی، طبائع کا تنوع اور ایک واقعہ یا حالات سے مختلف لوگوں کے متاثر ہونے کی کیفیات میں جو اختلاف ملتا ہے اس کا اقتضا یہ ہے کہ ہمارا نظام اخلاق ایسا متوازن اور معتدل ہو کہ اس میں نرم و گرم، جمالی و جلالی دونوں قسم کی قوتوں کا مناسب امتزاج پایا جاتا ہو۔ وہ طاقت اور سختی کا بھی مظہر
صلابت رکھتا ہو تو دوسری طرف ماں کے دل کا گداز بھی وہ طاقت اور سختی کا بھی مظہر ہو اور مسکنت اور عاجزی کا بھی۔ کوہ گراں بھی ہو اور آب رواں بھی، شعلہ بھی اور شبنم بھی نہ وہ شروع سے آخر تک مسیحیت کی انفعالیت اور عاجزی ہی کی تشریح ہو اور نہ شریعت موسوی کی قانونیت اور سختی ہی کی توضیح، بلکہ ان دونوں کو اپنے آغوش میں لے کر ایک ایسا توسط اور توازن پیدا کرے کہ امن و عدل، بلند ہمتی و استقلال، قوت و حرکت، آزادی و حق گوئی، عزم و وقار، عاجزی و فروتنی رحم و عفو، حلم و بردباری، صبر و سکون رفاقت و محبت، استغنا و قناعت، توکل، سخاوت

عصمت، حیا، شجاعت، مردانگی، سیرچشمی، بلند نظری، غرض تمام انسانی اوصاف اس میں نمایاں ہوں، جو غضب و شہوت کی قوتوں کا استیصال نہ کرے کیونکہ اس طرح یہ دنیا ایک وسیع قبرستان ہو کر رہ جائے گی۔ اور نہ ان کو ہوا ہی دے کہ ہم سب درندوں کی سطح پر اتر آئیں۔ بلکہ ان کی صحیح تربیت کا انتظام کرے۔ اور انھیں افراط و تفریط کا شکار نہ ہونے دے۔ پیروان مسیحیت نے غضبی و شہوانی قوتوں کو بنفسہٖ برا قرار دے کر ایک بڑی غلطی کی ہے، نطشے (NIETZSCHE) نے اسی لئے مسیحی فلسفۂ اخلاق سے منھ پھیر لیا تھا جب تک پروٹسٹنزم نے اس رہبانی اخلاقیت کے خلاف بغاوت کر کے نفس کے ان اجزا کو تمدن اور اخلاق میں مناسب جگہ نہ دی۔ یورپ کے ذہن پر ایک طرح کا جمود چھایا رہا۔ ان قوتوں میں بذات خود کوئی برائی نہیں ہے در اصل ان ہی سے شجاعت، حوصلہ مندی، استقلال، پامردی، محبت اور بہت سی دوسری اچھائیاں ابھرتی ہیں جن کے بغیر ہماری زندگی پھیکی اور بدمزہ ہی نہیں بلکہ دنیا کے قریب قریب سارے اونچے اصول بے جان کے قالب بن جائیں گے برائی ان کے غلط استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ضرورت انکے استعمال کا صحیح موقع اور محل مقرر کرنے کی ہے، اور ان راستوں کے تعین کی جن میں بہہ کر حیات و قوت کے یہ دھارے معاشرہ کی شادابی اور نکھار کا سبب بن سکتے ہیں۔ ان کو خشک کرنے کی نہیں کیوں کہ ان کے خشک ہونے سے تہذیب مرجھا جائے گی اور دنیا ویران ہو جائے گی۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم کا یہی منشا ہے۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

دوسری خصوصیت اسلامی تعلیم کی اس کی ہمہ گیری اور تمام اچھائیوں اور برائیوں

کے سارے جزئیات کی احاطہ بندی ہے جبکہ دوسرے اخلاقی معلموں نے اپنی ہدایتیں صرف ایک قوم یا ایک زمانہ کی اصلاح تک محدود رکھیں، اسلام کے پیغمبر نے کل قوموں اور کل زمانوں کے حالات ملحوظ رکھ کر اخلاقی اصلاحات کی فہرست مرتب کی، سارے محاسن اور مفاسد کھول کر بیان کئے، ایک کا حکم دیا۔ دوسرے سے منع کیا، یہاں تک کہ اخلاقی اور نفسیاتی کیفیتوں اور حالتوں کا کوئی گوشہ توجہ اور ہدایت کا محتاج نہیں رہا۔۔۔۔ جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے "اسلام نے اپنے اصول احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہو گیا ہے اور نیکیوں کے مظاہر عام ہو گئے ہیں۔ اسکے برخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت نامکمل اجمالی تشریح کی ہے"۔[۱]

اسلامی اخلاقیات کی ایک اور خوبی جو اسے دوسرے مکاتب اخلاق پر فوقیت دیتی ہے اسکے معلم کا وہ عظیم الشان اسلوب تعلیم ہے جس کی مثال تاریخ کو لاکھ کھنگالئے، کہیں نہیں ملتی۔ آپ نے قول کے ساتھ عمل کو اتنے مکمل طریقہ پر ملا لیا تھا کہ آپ کی ذات مبارک قرآن مجید کی جیتی جاگتی، زندہ و تابندہ تفسیر بن گئی تھی۔

جس کے سپرد نوع انسانی کی تعلیم اور تزکیہ ہو وہ خود اگر زندگی کے تمام نشیب و فراز اور معاشرہ کے پیچ و خم سے ہو کر نہ گذرے تو اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتا ہے، کیونکہ پھر اسکی تعلیم عملی حیثیت رکھنے کے بجائے علمی و نظریاتی یعنی اصولوں کا گلدستہ بن جائے گی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں ہم کو

---

[۱] سیرۃ النبی، جلد ششم، ص ۱۱۵

ایک بے مثال جامعیت ملتی ہے، آپ کی سیرت سے زندگی کے تمام پہلو اُبھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ کی زندگی میں ظلم کے پہاڑ بھی ٹوٹے، مصیبتوں اور آزمائشوں کی آندھیاں بھی آئیں، ناکامیوں کا اندھیرا بھی چھایا، اور فتحمندی اور کامرانی کے شادیانے بھی بجے قوت وحکومت کے پرچم بھی لہرائے اور مسرتوں کے پھول بھی کھلے، آپنے دوستی بھی برت کر دکھائی اور دشمنی بھی، جنگیں بھی لڑیں اور صلح وآشتی کے عہدنامے بھی کئے۔ دن دن بھر روزے رکھے اور رات رات بھر نمازیں بھی پڑھیں اور ملکی اور سیاسی گتھیاں بھی سلجھائیں۔ غارِ حرا میں خلوت نشین اور ماہ رمضان میں معتکف بھی رہے۔ اور خانگی زندگی کا لطف بھی اٹھایا۔ دینِ پاک کے سب سے بڑے مبلّغ، ہادی اور رہبر کا فرض بھی انجام دیا۔ اور مسلمانوں کی آزاد ریاست کی داغ بیل بھی ڈالی۔

نرمی اور سختی کے مواقع اور محل کو بھی رسول اللہ صلعم خوب پہچانتے تھے، جہاں حدود الہٰی کے ٹوٹنے کا سوال ہوتا تھا، وہاں آپ سختی کرنے میں تامل نہ فرماتے تھے اور جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل اور رذائل ہی سے تعلق ہوتا تھا وہاں آپ نرمی ہی سے کام لیتے تھے، حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ سے روایت ہے کہ آپنے کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ مگر جو کوئی شریعت کی حد توڑتا تھا اُسے سزا دیتے تھے۔

ایک بار قریش کی ایک خاتون چوری کے جرم میں پکڑی گئیں، بعض عزیز ترین صحابہ نے انکی سفارش کرنا چاہی تو آپنے اُنکی نہ سُنی اور فرمایا۔ تم سے پہلے کی قومیں اس لئے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو انکو سزا دی جاتی تھی۔ اور جب بڑے لوگ کرتے تھے تو انکا جرم نظرانداز کر دیا جاتا تھا۔ اسی موقع پر

یہ بھی فرمایا ـــــــ کہ خدا کی قسم اگر میری بیٹی بھی کبھی یہ جرم کرے تو میں اللہ کے قانون کے مطابق اس کا ہاتھ کاٹ ڈالوں گا۔

اسی طرح نرمی کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبویؐ میں ایک بدوی آیا۔ اتفاق سے اُسے پیشاب کی حاجت ہوئی تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں پیشاب کرنے لگا، صحابہ نے یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اُسے ڈانٹنا شروع کیا، آپنے روکا اور فرمایا کہ تم سختی کے لئے نہیں، بلکہ نرمی کے لئے بھیجے گئے ہو، اسکے بعد اس بدوی کو بلا کر سمجھایا کہ یہ مساجد عبادت کے گھر ہیں، یہاں نماز پڑھی جاتی ہے، یہ پیشاب یا خانہ کی جگہ نہیں ہے۔ اور لوگوں سے فرمایا کہ اس پر پانی بہا دو۔

۲

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی بابت حضرت عائشہ صدیقہ سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے ساری داستان ایک جملہ میں کہہ دی۔ انھوں نے کہا:۔

"آپ کا اخلاق من وعن قرآن تھا"۔

ایک اور موقع پر آپنے ذرا تفصیل سے بتایا کہ:۔

"آنحضرت صلعم کی عادت کسی کو برا کہنے کی نہ تھی آپ برائی کرنے والے کے ساتھ بھی برائی نہیں کرتے تھے، بلکہ اسے معاف کر دیتے تھے، جب آپ کو کسی دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تھا تو ان میں جو آسان ہوتی اسے اختیار کرتے تھے، بشرطیکہ اس میں کوئی گناہ کا شائبہ نہ ہو کیونکہ گناہ سے آپ بہت دور رہتے تھے، کبھی اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا۔

لیکن جو احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتا اس سے خدا خود انتقام لیتا تھا (یعنی احکامِ ربانی کے مطابق آپ اسکی سزا مقرر کرتے تھے) آپنے نام لے کر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی، اور کسی غلام یا لونڈی یا کسی عورت یا خادم یا جانور کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ آپ کسی کی درخواست رد نہیں فرماتے تھے بشرطیکہ وہ ناجائز نہ ہو۔ آپ جب گھر میں تشریف لاتے تو مسکراتے ہوئے آتے۔ دوستوں میں بھی پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے، باتیں اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ سکے"۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی آغازِ نبوت سے لے کر وفات تک برابر آپکے ساتھ رہے تھے۔ ان سے حضرت امام حسینؓ نے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا کہ :۔

"آپ خندہ جبیں و نرم خو تھے، سخت مزاج اور سنگ دل نہ تھے، نہ شور وغل کرتے تھے نہ کوئی برا کلمہ منہ سے نکالتے تھے، نہ عیب جو اور سخت گیر تھے کوئی بات ناپسند ہوتی تو اغماض فرماتے تھے، آپ نے اپنے نفس سے یہ تین باتیں بالکل خارج کر دی تھیں :۔ (۱) بحث و مباحثہ (۲) بے ضرورت باتیں کرنا، (۳) بے مطلب کی بات میں پڑنا۔ دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔ (۱) کسی کو برا نہیں کہتے تھے (۲) کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے، (۳) کسی کی ٹوہ میں نہیں لگتے

تھے، دوسروں کے منھ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے۔

نہایت فیاض، نہایت راست گو، نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے، اگر کوئی دفعتاً سامنے آجاتا تھا تو مرعوب ہوجاتا تھا، لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپ سے محبت کرنے لگتا۔[۱]

ہند بن ابی ہالہ گویا آپ کے آغوش کے پروردہ تھے۔ انکا بیان ہے کہ:۔

"آپ نرم خو تھے، سخت مزاج نہ تھے، کسی کی توہین روا نہیں رکھتے تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہار شکر فرماتے تھے، کسی چیز کو بُرا نہیں کہتے تھے، کھانا جس قسم کا سامنے آتا تناول فرماتے تھے اور اُس کو برا نہ کہتے۔ اگر کوئی کسی امرِ حق کی مخالفت کرتا تو آپ کو غصہ آجاتا، مگر اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی آپ کو غصہ نہیں آیا نہ کسی سے انتقام لیا۔"[۲]

حضرت انسؓ جو خادم خاص تھے کہتے ہیں کہ:۔

"میں نے دس برس تک آپ کی خدمت کی مگر آپ نے کبھی کسی معاملہ میں بازپرس نہیں فرمائی۔"[۳]

مالک بن حویرث جو بیس دن تک آپ کی صحبت میں رہے کہتے ہیں کہ "آپ رحمدل اور رقیق القلب تھے۔"[۴]

حجۃ الاسلام امام غزالی 'کیمیائے سعادت' میں تحریر فرماتے ہیں:۔

۱ؔ شمائل ترمذی ۲ؔ ایضاً ۳ؔ صحیح مسلم ۴ؔ صحیح بخاری۔

"آپ مویشیوں کو خود چارہ ڈال دیتے۔ گھر میں جھاڑو دے لیتے، بکری دوھ لیتے، خادموں کو اُنکے کاموں میں مدد دیتے، ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھالیتے، بازار سے سودا خرید لاتے، ادنیٰ واعلیٰ کو پہلے خود سلام کرتے، کوئی ساتھ ہو لیتا تو اسکے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے، غلام و آقا، حبشی و ترک میں فرق نہ کرتے، رات دن کا لباس ایک ہی رکھتے، کیسا ہی حقیر شخص دعوت دیتا فوراً قبول فرمالیتے، جو کھانا سامنے رکھ دیا جاتا رغبت سے کھالیتے، رات کے کھانے سے صبح کے لئے اور صبح کے کھانے سے رات کے لئے اٹھا نہ رکھتے نیک مزاج، نرم خو، کشادہ دل اور خندہ جبیں تھے، مگر زور سے نہیں ہنستے تھے، اندوہ گین تھے مگر ترشرد نہ تھے۔ سخی تھے مگر فضول خرچ نہ تھے"

اور حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ:۔

"کنبہ والوں اور خادموں پر بہت زیادہ مہربان تھے زبانِ مبارک پر کبھی کوئی گندی بات یا گالی نہیں آئی، کسی پر لعنت نہیں کرتے تھے، دوسروں کی ایذارسانی پر صبر فرماتے تھے، کنبہ کی اصلاح اور قوم کی درستی پر بہت توجہ فرماتے تھے ہر شخص اور ہر چیز کی قدر و منزلت سے آگاہ تھے، آسمانی بادشاہت پر ہمیشہ نظر جمائے رہتے تھے"

صحیح بخاری میں ہے کہ:۔

"آپ اطاعت شعاروں کو بشارت سنانے والے گناہ گاروں کو ڈرانے والے اور بے خبروں کو ہوشیار کرنے والے خدا کے بندے اور رسول تھے، تمام معاملات اللہ پر چھوڑنے والے تھے۔ نہ درشت خو تھے نہ سخت گو، بدی کے بدلے میں بدی نہ کرتے تھے۔ معافی مانگنے والوں کو معاف فرما دیتے تھے، اور گناہ گاروں کو بخش دیتے تھے۔ ان کا کام مذاہب کی کجیوں کو مٹانا تھا۔ ان کی تعلیم اندھوں کو آنکھیں اور بہروں کو کان عطا کرتی تھی۔ آپ تمام خوبیوں سے آراستہ جامع اوصافِ حمیدہ تھے۔ سکینت ان کا لباس، نیکی ان کا شعار، تقویٰ ان کا ضمیر حکمت ان کا کلام، عدل ان کی سیرت، راستی انکی شریعت اور ہدایت انکی رہنما تھی۔ آپ ذلت دور کرنے والے، گمناموں کو رفعت بخشنے والے، مجہولوں کو طاقت دینے والے، قلت کو کثرت اور تنگدستی کو غنا سے بدلنے والے تھے۔"

مشہور انگریز ادیب ٹامس کارلائل (THOMAS CARLYLE) نے لکھا ہے کہ:۔

"آپ کا گھر بار معمولی اور کمتر لوگوں کے طرز کا تھا، اور آپ کی عام غذا جو کی روٹی اور پانی، اکثر آپ کے چولھے میں مہینوں آگ نہیں روشن ہوتی تھی، (آپ کے سیرت نگار فخریہ بیان کرتے ہیں

آپ اپنے ہاتھ سے جوتے گانٹھ لیتے اور کپڑوں میں پیوند لگا لیا کرتے تھے ...... کسی طرّہ دار شہنشاہ کی اتنی اطاعت نہیں کی گئی جتنی کہ اس شخص کی اسکے اپنے ہاتھ کی سی ہوئی عبا میں ہوتی تھی ۔"

اور رومیوں کے انحطاط و زوال کا شہرۂ آفاق مورّخ ایڈورڈ گبن (EDWARD GIBBON) لکھتا ہے کہ :-

"اپنی دنیوی طاقت کے عروج پر بھی محمدؐ کی شرافتِ نفس نے شاہانہ تزک و احتشام روا نہ رکھا۔ خدا کا پیغمبر گھر کے ادنیٰ کام اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ آگ روشن کرتا تھا، جھاڑو دیتا تھا، بھیڑوں کا دودھ دوھتا تھا اور اپنے کمبل اور جوتوں کی خود مرمّت کر لیا کرتا تھا، تارک الدنیا راہبوں کے مجاہدوں سے نفرت کرتے ہوئے آپ بلا تصنّع اور تکلّف ایک عرب اور سپاہی کی طرح سادہ غذا استعمال فرماتے تھے جن خاص خاص مواقع پر آپ صحابہ کی دل کھول کر ضیافت کرتے تھے مگر نجی زندگی میں اکثر آپ کے گھر میں ہفتوں چولھا نہیں جلتا تھا۔"

فرانسیسی مورخ پروفیسر سیڈیو (PROF, SEDILLOT) نے اخلاق و عادات نبوی کا ذکر کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے :-

"آپ خندہ رو، ملنسار، اکثر خاموش رہنے والے، بکثرت ذکرِ خدا کرنے والے، لغو اور بیہودہ باتوں سے نفرت کرنے

والے، بہترین رائے رکھنے والے تھے ....

"آپ نہایت منصف مزاج تھے، مسکینوں سے محبت کرتے تھے، غریبوں میں رہ کر خوش ہوتے تھے، تنگدست کو اس کی تنگ دستی کی وجہ سے نہ تو حقیر اور نہ بادشاہوں کو ان کی بادشاہت کی بنا پر برتر سمجھتے تھے۔"

قرآن مجید کے انگریز مترجم اور مفسر مارماڈیوک پکتھال (MARMADUKE PICKTHALL) نے یہ الفاظ لکھے ہیں:۔

"عرب پر حکمراں ہو جانے کے بعد بھی آپ اپنے پیروؤں سے برادرانہ انداز سے ملتے رہے، آپ کو نقیبوں اور پہرداروں کی ضرورت نہ تھی۔ اپنے لوگوں میں سادگی اور آزادی سے گھومتے پھرتے تھے، ایک رہنما کی حیثیت سے، ایک مصلح کی حیثیت سے، اور ایک آزمائے ہوئے دوست کی حیثیت سے۔"

جرمن مصنف ڈاکٹر گستاف وائل (GUSTAV WEIL) نے لکھا ہے:۔

"محمدؐ اپنی قوم میں ایک روشن مثال تھے، آپ کا کردار پاک اور بے داغ تھا۔ لباس اور غذا میں ایک انوکھی سادگی تھی۔ مزاج میں اتنی سادگی اور بے تکلفی تھی کہ اپنے ساتھیوں سے کوئی خاص تعظیم و تکریم قبول نہیں فرماتے تھے۔ اور اپنے غلام سے کوئی ایسی خدمت نہ لیتے تھے جو خود انجام دے سکتے، آئے دن آپ بازاروں میں سودا خریدتے، اور گھر میں

کپڑوں میں پیوند لگاتے اور بکری دوہتے نظر آتے تھے، ہر وقت ہر شخص کی آپ تک رسائی ہو سکتی تھی۔ بیماروں کی عیادت کرتے تھے اور ہر ایک سے ہمدردی رکھتے تھے۔ آپکی سخاوت اور خیر وخیرات کی کوئی حد نہ تھی۔ باوجود ان بے اندازہ تحائف کے جن کی آپ پر ہر وقت بارش ہوا کرتی تھی، آپنے نہایت مختصر ترکہ چھوڑا اور وہ بھی بیت المال کو ہبہ فرما گئے تھے"۔

اور واشنگٹن اِروِنگ (WASHINGTON IRVING) کا یہ بیان ہے :-

"اپنے انتہائی قوت واقتدار کے دور میں بھی آپنے وضع قطع، اور اخلاق وعادات میں وہی سادگی قائم رکھی جو پریشانی اور بے طاقتی کے زمانہ میں آپ کا وصف رہی تھی۔ شاہانہ کرّ وفر تو بڑی بات ہے۔ اگر کسی مجلس میں آپکے ساتھ کچھ خصوصیت کا برتاؤ کیا جاتا تو وہ بھی آپکو بہت ناگوار ہوتا تھا"

اس طرح کی شہادتیں اور بیانات کہاں تک نقل کیے جائیں ان کا سلسلہ لامتناہی ہے۔

۳

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ اوصاف کا کچھ اندازہ

ذیل کے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنے آیا، آپکو اطلاع ہوئی، تو فرمایا کہ "اگرچہ وہ اپنے قبیلہ کا اچھا آدمی نہیں ہے مگر آنے دو۔" وہ آیا تو آپنے نرمی سے گفتگو کی، اس پر حضرت عائشہ کو تعجب ہوا اور اسکے واپس جانے کے بعد انھوں نے آپ سے دریافت کیا کہ "آپ تو اُسے اچھا آدمی نہیں سمجھتے تھے پھر اتنی شگفتہ مزاجی سے کیوں باتیں کیں۔" آپ نے جواب دیا۔ "خدا کے نزدیک، وہ آدمی سب سے بُرا ہے جس کی بدزبانی کے باعث لوگ اس سے ملنا چھوڑ دیں۔"

اپنی غیر معمولی فیاضی اور دریا دلی کی وجہ سے آپ اکثر مقروض رہا کرتے تھے۔ مدینہ میں آپ وقتاً فوقتاً یہودیوں سے قرض لیا کرتے تھے، اگر کبھی ادائیگی میں دیر ہو جاتی تو وہ سختی سے تقاضہ کرتے تھے، آپ انکی بدمزاجی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا کرتے تھے۔

ایک دن ایک بدّو گوشت بیچ رہا تھا۔ آپنے اس بھروسہ پر کہ گھر میں کھجوریں رکھی ہیں، کچھ کھجوروں کے عوض میں گوشت چکا لیا، لیکن گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ کھجوریں ختم ہو چکی تھیں، چنانچہ آپنے باہر آکر بدّو سے فرما دیا کہ "اتفاق سے میرے یہاں اس وقت کھجوریں نہیں ہیں، تم اپنا گوشت واپس لے لو۔" اس نے شور کرنا شروع کر دیا کہ "ہائے بددیانتی"۔ صحابہؓ نے بہتیرا سمجھایا کہ "بھلا اللہ کے رسول بددیانتی کریں گے۔" مگر وہ نہ مانا اور اپنی بات کہے گیا۔ صحابہؓ کو یہ بُرا لگا اور انھوں نے ڈانٹ کر اُسے خاموش کرنا چاہا مگر آپنے انھیں روک دیا کہ "اسے کہنے دو۔

اس کا حق ہے۔" آخر آپنے ایک انصاریہ کے یہاں سے کھجوریں منگوا کر گوشت کی قیمت ادا کی۔

آپ کی خدمت میں ایک بار ایک سائل حاضر ہوا، آپنے اُسے بٹھالیا۔ پھر دوسرا اور اسکے بعد تیسرا آیا، آپنے ان سے بھی کہا کہ "بیٹھو۔ میرے پاس تو اس وقت کچھ نہیں ہے لیکن خدا دے گا تو تمھاری حاجت پوری کر دوں گا۔" اتنے میں کسی نے چار اوقیہ چاندی ہدیہ کی، آپنے ایک ایک اوقیہ تینوں سائلوں میں تقسیم کر دی اور چوتھی کی بابت اعلان کر دیا کہ جب ضرورت ہو لے لے۔ مگر رات ہو گئی اور کوئی اس کا خواہشمند نہ ہوا، مجبوراً جب سونے کے لئے لیٹے تو اسے سرہانے رکھ لیا مگر نیند نہ آئی، بار بار اُٹھتے اور نماز پڑھنے لگتے، حضرت عائشہؓ نے یہ دیکھا تو انھیں تشویش ہوئی۔ انھوں نے پوچھا، "کیا کچھ طبیعت ناساز ہے؟" آپ نے فرمایا "نہیں۔" انھوں نے کہا "پھر آپ اس قدر بے چین کیوں ہیں؟" تو آپ نے سرہانے سے چاندی نکال کر دکھائی اور فرمایا۔ "اس نے مجھے بے چین کر رکھا ہے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں مجھے اس حال میں موت نہ آجائے کہ یہ چاندی میرے پاس ہو۔"

حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول پاکؐ نے ان سے فرمایا کہ "ابو ذر! اگر اُحد کا پہاڑ بھی میرے لئے سونا ہو جائے تب بھی میں یہ نہ پسند کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور میرے پاس ایک دینار بھر بھی رہ جائے، علاوہ اُسکے کہ جو میں ادائگی قرض کے لئے چھوڑ دوں۔"

بعض اوقات ایسا بھی کرتے کہ کسی سے کوئی چیز مول لیتے تو قیمت

ادا کرنے کے بعد وہی چیز اُسے بطور ہدیہ عنایت فرما دیتے۔

کھانے پینے کی معمولی سے معمولی چیز کو بھی تنہا نوش نہ فرماتے تھے، جو لوگ بروقت موجود ہوتے ان کو ضرور شریک کر لیتے تھے۔

ایک بار آپ کہیں جا رہے تھے کہ ایک حاجتمند نے سوال کیا۔ آپ اس وقت بالکل خالی ہاتھ تھے لیکن اُسے رخصت نہیں کیا بلکہ ساتھ چلنے کو کہا کہ شاید راستہ میں کوئی صورت نکل آئے۔ حضرت عمر فاروق بھی ہمراہ تھے، انھوں نے عرض کیا کہ "آپ خود خالی ہاتھ ہیں تو آپ پر کیا ذمہ داری ہو سکتی ہے" ایک اور صحابی وہیں موجود تھے، انھوں نے کہا "یا رسول اللہ آپ دیئے جائیے۔ خدا آپ کو محتاج نہیں کرے گا" یہ بات آپ کو بہت پسند آئی۔

آپ اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ زہرہ سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ وہ تشریف لاتیں تو آپ فرطِ محبت سے کھڑے ہو جاتے اور انکی پیشانی کو بوسہ دیتے۔ تاہم انکی تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ ان کے گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی، اپنے ہاتھ سے چکی پیستیں اور خود ہی مشک میں پانی بھر لاتیں، چکّی پیستے پیستے ان کے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے تھے اور مشکیزہ اٹھاتے اٹھاتے شانہ پر نیل اُبھر آئے تھے ایک غزوہ میں کچھ کنیزیں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں تو انھیں خیال ہوا کہ اگر ایک کنیز ان کی خدمت میں دیدی جائے تو انکو اتنی محنت نہ کرنا پڑے، خود باپ سے کہنے کی تو ہمت نہ ہوئی۔ حضرت علیؓ کے ذریعہ سفارش کرائی، لیکن آنحضرت صلعم نے فرمایا: "ابھی اصحاب صفہ کا انتظام نہیں ہو سکا ہے، جبتک یہ نہ ہو لے میں کسی اور کے لئے کچھ نہیں کر سکتا"

مسلمان، مشرک، کافر بھی آپکے مہمان ہوا کرتے تھے، آپ ان کی یکساں تواضع اور مدارت فرماتے تھے، اکثر گھر میں جو کچھ ہوتا وہ مہمانوں کی نذر ہو جاتا اور اہل وعیال فاقہ سے رہتے، مہمانوں کے آرام کا اتنا خیال تھا کہ رات کو اٹھ اٹھ کر ان کی خبر گیری فرمایا کرتے تھے۔

سائلوں کی حتی الامکان مدد فرمانے کے باوجود گداگری سے آپ کو بڑی نفرت تھی، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص پیٹھ پر لکڑی لاد کر بیچے اور اس طرح اپنی آبرو بچائے تو یہ سوال کرنے سے بہتر ہے۔

ایک دفعہ ایک انصاری نے آپ سے سوال کیا۔ آپنے ان سے پوچھا۔ "تمہارے پاس کوئی چیز ہے؟" ان کے پاس ایک بچھونا اور ایک پیالہ تھا، وہ منگوا کر آپ نے دو درہم کو فروخت کر دیا اور انصاری سے فرمایا کہ "ایک درہم کا کھانے کا سامان لے کر گھر دے آؤ اور دوسرے کی رسّی خرید کر جنگل سے اس میں لکڑیاں باندھ کر لاؤ اور شہر میں بیچو۔" پندرہ روز بعد وہ پھر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تو ان کے پاس دس درہم جمع ہو گئے تھے، حضور سرور کائنات یہ دیکھکر بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ "یہ اس سے بہتر ہے کہ کوئی شخص قیامت میں گداگری کا داغ چہرہ پر لے کر اٹھے۔

اپنے خاندان کے لئے آپنے صدقہ و زکوٰۃ لینا حرام کر دیا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ "میں کبھی کبھی اپنے بستر پر کھجوریں پڑی ہوئی دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ اٹھا کر کھا لوں مگر یہ سوچ کر رک جاتا ہوں کہ کہیں صدقہ کی نہ ہوں۔"

حضرت امام حسنؓ نے ایک بار صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور

منھ میں ڈال لی تو آپ نے انھیں ٹوکا ــــ "کیا تم کو معلوم نہیں ہے کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا"۔ حضرت امام حسنؓ نے فوراً کھجور اگل دی۔

آپ کو کسی کا احسان لینا پسند نہ تھا اور بغیر قیمت دئیے کوئی چیز نہیں لیتے تھے۔ ایک سفر میں حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ دونوں آپ کے شریک تھے۔ عبداللہ بن عمرؓ کی سواری کا اونٹ سرکش تھا اور بار بار رسول اللہ صلعم کے ناقہ کے آگے نکل جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ ہر دفعہ ان کو ڈانٹتے تھے۔ وہ لاکھ کوشش کرتے مگر اونٹ قابو میں نہ آتا، آپ نے عبداللہ بن عمرؓ کی مجبوری محسوس کی تو حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ "تم یہ اونٹ میرے ہاتھ بیچ ڈالو، انھوں نے نذر کرنا چاہا لیکن بلا قیمت لینے سے آپنے انکار کر دیا، آخر کار حضرت عمرؓ دام لینے پر راضی ہو گئے اور آپ نے اونٹ خرید کر عبداللہ بن عمرؓ کو دیدیا کہ "اب یہ تمھارا ہے"۔

آپکے عدل و انصاف کی یہ شہرت تھی کہ یہودی تک اپنے مقدمات آپکے سامنے پیش کرتے تھے اور آپ انکی شرع کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ "قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے علاوہ اور کوئی سایہ نہ ہوگا تو سات اشخاص کو خدا اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک عادل فرمانروا ہوگا"۔

شرعی حدود کے بارہ میں آپ کسی کی سفارش نہیں سنتے تھے، اسامہ بن زیدؓ آپ کو بہت محبوب تھے، ایک بار انھوں نے ایک ملزمہ کی معافی کی درخواست کی تو آپنے نہایت برہم ہو کر فرمایا کہ "تم حدود شرعی میں مداخلت کرتے ہو؟ خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی ایسا کرتی تو میں اُسے وہی سزا دیتا جو اسکو دوں گا"۔

ایک دن آپ مال غنیمت تقسیم کر رہے تھے، لوگوں کا بہت ہجوم تھا۔

ایک بے ادب شخص منھ کے بل آپ پر آپڑا، آپکے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی تھی اس سے آپنے اس کو ٹھوکا دیا، اتفاق سے چھڑی اسکے سر پر لگی اور خراش آگئی آپ نے فوراً اسکی طرف چھڑی بڑھا دی اور فرمایا "بدلہ لے لو" اس نے کہا۔ "یا رسول اللہ! میں نے معاف کیا"

رحم کی صفت اتنی غالب تھی کہ سزا دینے میں آپ انتہائی احتیاط برتتے تھے اور جہاں تک گنجائش ہوتی درگزر کرنا چاہتے تھے۔

ایک صاحب نے آکر اقرار کیا کہ وہ زنا کے مرتکب ہو گئے تھے، آپنے منھ پھیر لیا، وہ گھوم کر دوسری طرف حاضر ہوئے۔ آپنے پھر رخ موڑ لیا۔ جب کئی بار ایسا ہی ہوا تو آپ نے پوچھا۔ "تمھیں جنون تو نہیں ہو گیا ہے؟" انھوں نے کہا۔ "جی نہیں" پھر آپنے پوچھا "تمھاری شادی ہو چکی ہے؟" انھوں نے عرض کیا۔ "جی ہاں"۔ آپنے فرمایا۔ "تم نے شاید صرف ہاتھ لگایا ہوگا"۔ انھوں نے کہا، جی نہیں، مجامعت کی ہے۔ ان ساری وضاحتوں کے بعد ناچار آپنے حکم دیا کہ "سنگسار کئے جائیں"۔

تیرے الطاف سے دشمن اسی طرح فیضیاب ہوتے تھے جیسے کہ دوست۔

مکّہ والوں کی دشمنی کے باعث ایک بار ثمامہ بن اثال نے نجد سے مکّہ غلّہ جانا روک دیا تھا، آپ کو اطلاع ہوئی تو فوراً حکم دیا کہ غلّہ نہ روکا جائے۔

ایک دفعہ ایک درخت کی شاخ سے تلوار لٹکا کر اسکے سایہ میں آپ سو رہے تھے کہ غورث بن الحرات ادھر سے گزرا، اس نے چپکے سے تلوار اتار لی اور اسے کھینچ کر آپ کو جگایا اور بولا۔ "اب تم کو کون بچا سکتا ہے؟" آپنے آسمان کیطرف انگلی اٹھا کر فرمایا۔ "اللہ!" غورث پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ آپکے اسکے ہاتھ سے

تلوار چھین لی اور ارشاد فرمایا۔ "اب تم کو کون بچا سکتا ہے؟" غورث سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ آپ نے اُسے معاف کر دیا۔

حضرت زینبؓ آپ کی صاحبزادی حمل سے تھیں۔ ان کے ہبار نے نیزہ مار دیا اور حمل ساقط ہو گیا۔ بالآخر یہی صدمہ ان کی موت کا باعث ہوا۔ ہبار نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر معافی چاہی اور رحمت عالمؐ نے معاف کر دیا۔

بچوں سے نبی اکرمؐ بڑی محبت فرماتے تھے۔ ان کے قریب سے گزرتے تو خود سلام کرتے اور اُن کے سروں پر ہاتھ پھیرتے، بوڑھوں کا بھی بہت احترام کرتے تھے، مکہ فتح ہونے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے بوڑھے اور نابینا باپ کو بیعت کرانے آپ کے پاس لے کر آئے تو آپ نے بڑی نرمی سے فرمایا۔ "تم نے ان کو کیوں زحمت دی؟ میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔"

آپ نے جنگ میں کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا، ابی بن خلف آپ کا شدید دشمن تھا، اس نے ایک نفیس گھوڑا تیار کیا تھا اور ہر جگہ کہتا پھرتا تھا کہ میں نے یہ اس لیے تیار کیا ہے کہ اس پر سوار ہو کر محمدؐ کو قتل کروں گا۔ اُحد کی لڑائی میں وہ صفوں کو چیر پھاڑ کر آپ کے قریب پہونچ گیا۔ صحابہ کرام نے اُسے روکنا چاہا۔ مگر آپ نے فرمایا کہ آنے دو اور جب وہ بالکل پاس آگیا تو ایک مجاہد سے نیزہ لے کر اس کی گردن میں آہستہ سے اس کی نوک چبھو دی۔ وہ چیخ کر بھاگا، لوگوں نے یہ دیکھ کر اس سے کہا "یہ کوئی ایسا کاری زخم تو نہیں ہے کہ تم اتنا بدحواس ہو گئے" تو اس نے جواب دیا "کاری تو نہیں ہے مگر ہے تو محمدؐ کے ہاتھ کا۔"

شجاعت کے ساتھ بقول ابو سعید خدری "آپ میں کنواری لڑکیوں سے

زیادہ حیا تھی"۔ آپ حیا کو "جزو ایمان" فرماتے تھے۔

خدمت گزاری کے لیے صحابۂ کرامؓ جسم و جان سے حاضر رہتے تھے، لیکن آپ اپنا کام خود کرنا پسند کرتے تھے، ادنیٰ سے ادنیٰ کام میں آپ کو عار نہ تھی۔ ایک شخص نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر میں کیا مشغلہ رہتا تھا، تو انھوں نے بتایا کہ "آپ گھر کے کام کاج میں مشغول رہتے تھے۔ کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے پیوند لگاتے تھے، جھاڑو بھی دے لیتے تھے، دودھ دوہ لیتے تھے، جوتا پھٹ جاتا تو خود مرمت کر لیتے تھے، اونٹ کو چارہ ڈال دیتے تھے، اور بازار سے سودا خرید لاتے تھے۔

حضرت انس بن مالکؓ ایک دن آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ آپ اپنے ہاتھ سے اونٹ کے بدن پر تیل مل رہے ہیں۔

اجتماعی محنت و مشقت کے کاموں میں آپ برابر کی شرکت فرماتے تھے قبا اور مدینہ کی مسجدوں کی تعمیر ہو یا جنگ میں خندق کھودنا ہو آپ ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے، ایک سفر میں صحابہ نے بکری ذبح کی اور اس کو پکانے کا کام آپس میں بانٹ لیا۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا "جنگل سے لکڑی میں لاؤں گا" صحابہؓ نے لاکھ عرض کیا کہ آپ آرام سے بیٹھیں، ہم سارا انتظام کر لیں گے۔ لیکن آپ نے فرمایا "میں امتیاز پسند نہیں کرتا"۔

دوسروں کے کام کر دینا بھی آپ کی عادت میں داخل تھا، ایک دفعہ نماز کے لیے جماعت کھڑی ہو چکی تھی کہ ایک بدو آیا اور اس نے بڑی بے باکی سے آپ کا دامن پکڑ کر کہا "میرا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے، ایسا نہ ہو کر

میں اسے بھول جاؤں۔ اس لیے پہلے اسے کر دو۔" آپ چپ چاپ اس کے ساتھ ہو گئے اور پہلے اس کی خدمت انجام دے دی پھر نماز ادا کی

خبابؓ، ایک صحابی، کسی لشکر میں گئے ہوئے تھے، ان کے گھر میں کوئی دوسرا مرد نہ تھا، اور عورتوں کو دودھ دوھنا نہیں آتا تھا۔ آپ روزانہ اُن کے گھر جا کر دودھ دوھ آتے تھے۔

حضرت انسؓ ایک عرصہ تک آپ کے خادم رہے تھے، ان کا بیان ہے کہ آپ نے ان سے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ تم نے فلاں کام کیوں کیا یا کیوں نہ کیا، انہی سے روایت ہے کہ ان کے لڑکپن کے زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کسی کام پر بھیجنا چاہا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ میں نہ جاؤں گا۔ اور باہر نکل کر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگے، کچھ دیر بعد آنحضرت صلعم نے پیچھے سے آکر پیار کے ساتھ ان کی گردن پکڑ لی اور فرمایا۔ "انس اب وہ کام کر دو۔"

زہد و قناعت کی یہ صورت تھی کہ حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ ہجرت کے بعد آنحضرت صلعم کو کبھی مسلسل تین روز تک گیہوں کی روٹی میسر نہیں ہوئی، اکثر دو دو مہینہ گھر میں چولھا نہیں جلتا تھا اور اہل بیت کھجور اور پانی پر بسر اوقات کرتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ فاقہ کی وجہ سے آپ کو بات کرنا مشکل ہو جاتا۔ صحابہؓ یہ کیفیت دیکھ کر سمجھ جاتے اور آپ کو مہمان بنا کر اپنے گھر لے جاتے۔

دُنیا سے بے رغبتی کا اندازہ آپ کی ان دو دعاؤں سے ہو سکتا ہے۔

(۱) "اے اللہ ایسا کر کہ ایک دن مجھے بھوکا رکھ اور ایک دن کھانے کو دے،

تاکہ بھوک میں تجھ سے گڑگڑا کر مانگا کروں اور کھا کر تیرا شکر کیا کروں۔" (۲) "اے اللہ! اولادِ محمدؐ کو بس اتنا دے کہ بھوکی نہ رہے۔"

عہد کے اتنے پابند، بات کے اتنے سچے، قول کے اتنے پکے اور معاملت کے اتنے صاف تھے کہ قریش تک نے آپ کو متفقاً "امین" کا خطاب دیا تھا۔ آپ کا اصول تھا کہ "جس میں پاسِ عہد نہیں اس میں دین نہیں۔"

ایک بار مکہ کے ایک غلام ابورافع قریش کے سفیر بن کر مدینہ آئے، وہ آپ کی دلآویز شخصیت سے ایسا متاثر ہوئے کہ انھوں نے فوراً اعلان کر دیا کہ اب کبھی لوٹ کر کافروں میں نہ جائیں گے، لیکن آپ نے فرمایا کہ "میں ایک قاصد کو اپنے پاس روک کر عہد شکنی نہیں کر سکتا۔ تم اس وقت لوٹ جاؤ اور اگر مکہ پہونچ کر تمھارے دل کی یہی کیفیت رہے تو پھر چلے آنا۔"

آپ کا بدترین دشمن ابوجہل بھی آپ کی صداقت کا معترف تھا۔ اس نے ایک بار آپ کے سامنے اس کا یوں اقرار کیا کہ "محمدؐ! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا لیکن اپنے دین کی جو باتیں تم ہم کو بتاتے ہو ان کو میں صحیح نہیں مانتا۔"

حق گوئی دراصل شجاعت ہی کی ایک شاخ ہے۔ ایک خطبہ میں آپ نے یہ نصیحت کی کہ "کسی شخص کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو چاہیئے کہ اس کے کہنے سے کسی انسان کا خوف مانع نہ ہو۔"

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا کہ "کوئی شخص خود کو حقیر نہ سمجھے" اس پر صحابہؓ نے عرض کیا کہ "ہم میں کوئی شخص اپنے کو کیونکر حقیر سمجھ سکتا ہے۔"؟ ارشاد ہوا کہ "اس طرح کہ اس کو خدا کے بارے میں ایک بات کہنے کی ضرورت ہو اور

وہ نہ کہے۔ قیامت کے روز خدا اس سے پوچھے گا کہ "تم کو میرے متعلق فلاں بات کہنے سے کس چیز نے روکا"؟ وہ کہے گا کہ "انسانوں کے خوف نے" خدا کی طرف سے اسے یہ جواب ملے گا کہ "تم کو سب سے زیادہ میرا خوف ہونا چاہئے تھا۔"

آپ کی ایک حدیث ہے کہ "سب سے بڑا جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا ہے۔"

خوش معاملگی اور دیانت داری کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ مکہ کے کفار بھی آپ کے پاس اپنی امانتیں رکھواتے تھے۔

سائب ایک تاجر تھے وہ مسلمان ہو کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو لوگوں نے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا تعارف کرانا چاہا۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ "میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں"۔ سائب نے بتایا کہ آپ تجارت میں میرے شریک تھے، میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ نے ہمیشہ معاملہ صاف رکھا۔"

ایک شخص سے آپ نے کچھ کھجوریں قرض لی تھیں۔ ادائگی کے وقت کچھ کھجوریں جو اس کو دینے کے لیے آپ کے پاس تھیں وہ اتنی اچھی نہ تھیں جتنی کہ اس کی تھیں اس لیے اُس نے لینے سے انکار کیا۔ صحابہ رضؓ نے کہا کہ "تم رسول اللہ صلعم کی عطا کی ہوئی چیز سے انکار کرتے ہو"؟ اُس نے کہا کہ اگر رسول اللہ صلعم ہی معاملہ میں صفائی نہ برتیں گے تو پھر کس سے توقع کی جائے۔ یہ سُن کر آپ کے آنسو آ گئے اور فرمایا کہ "یہ سچ ہے"

امانت کا تعلق آپ کے نزدیک صرف مادی اشیاء سے نہیں تھا، قانونی اور اخلاقی اُمور بھی اس میں شامل تھے۔ آپ کی احادیث میں ہے کہ کسی کا کوئی بھید معلوم ہو تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے یا کسی کی بابت کوئی شخص کوئی نامناسب بات کہے یا بُری رائے ظاہر کرے تو اس کو اس تک پہونچا کر فتنہ و فساد کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے۔ یا کوئی کسی نجی معاملہ میں مشورہ کرے تو اُسے اپنے ہی تک محدود رکھنا اور حتی المقدور بہترین مشورہ دینا بھی امانت داری میں شامل ہے۔ اسی طرح ملازم کا خیر خواہی اور مستعدی سے خدمت انجام دینا، بیوی، بچوں، اعزا، احباب اور ہمسایہ وغیرہ کے حقوق ادا کرنا یہ سب امانتیں ہیں اور ان میں کوتاہی کرنا امانتداری کے خلاف ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ حدیث بھی کس قدر جامع ہے کہ "اس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کسی بندہ کا اس وقت تک دین درست نہ ہوگا جب تک اسکی زبان درست نہ ہو۔ .... اور جو کوئی ناجائز راستہ سے مال پائے گا اور اس میں خرچ کرے گا تو اس کو اس میں برکت نہ دی جائے گی۔ اور اگر اس میں سے خیرات دے گا تو قبول نہ ہوگی۔ اور جو اس میں سے بچ رہے گا وہ اس کے سفر دوزخ کا توشہ ہوگا۔ بُری چیز بُری چیز کا کفارہ نہیں بن سکتی ہے، البتہ اچھی چیز بُری چیز کا کفارہ ہوتی ہے۔"

آپ نے یہ نصیحت بھی فرمائی کہ "میری اُمّت اسوقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہ سمجھے گی۔"

۴

غیبت، بہتان، عیب جوئی، بدگوئی، بدگمانی، دو رخاپن وغیرہ سے

آپ سخت نفرت فرماتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ "جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگائے جبکہ وہ بے گناہ ہو تو قیامت کے روز اُس کی پیٹھ پر کوڑے پڑیں گے۔"

قرآن شریف کی ان آیات میں ان اخلاقی رذائل کے بارے میں کتنے صاف اور صریح احکام پائے جاتے ہیں۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا	"مسلمانوں! (لوگوں کی بابت) بہت
کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ	شک کرنے سے بچتے رہو۔ کیونکہ بعض
الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا	شک گناہ میں داخل ہیں۔ اور ایک
وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا	دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور تم میں
اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ	کوئی ایک دوسرے کو بُرا نہ کہے، بھلا
لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ	تم میں یہ کوئی گوارا کرے گا کہ اپنے مردہ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ	بھائی کا گوشت کھائے۔ اور اللہ سے
رَّحِیْمٌ ۝	تقویٰ کرو۔ بیشک اللہ توبہ قبول کرنے
(حجرات۔۲)	والا اور رحم کرنے والا ہے۔

کچھ لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ غیبت کسے کہتے ہیں۔ آپ نے اس کے یہ معنیٰ بتائے کہ "تمھارا اپنے بھائی کی اُس چیز کا ذکر کرنا جسے وہ ناپسند کرے۔" لوگوں نے پھر سوال کیا کہ "اور اگر ہمارے بھائی میں وہ عیب موجود ہو؟" آپ نے فرمایا۔ "اگر وہ عیب اس میں موجود ہے تو تم نے غیبت کی اور اگر نہیں ہے تو تم نے بہتان باندھا۔"

منافقت اور دورُخے پن سے یہ کہہ کر ڈرایا کہ "قیامت کے دن تم سب سے

بُرا دو رُخے کو پاؤ گے جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اُس کا رُخ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور۔

خوشامد اور بیجا تعریف و توصیف سے نفرت کرتے تھے۔ ایک شخص کسی حاکم کی مدح کر رہا تھا۔ آپؐ کے صحابی حضرت مقدادؓ بھی موجود تھے۔ انھوں نے زمین سے خاک اٹھا کر اُس کے منھ میں جھونک دی اور کہا کہ "رسول اللہ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ مدّاحوں (تعریف میں مبالغہ کرنے والوں) کے منھ میں خاک بھر دیں۔"

اگرچہ آپ کثرت سے عبادت کرنے والے تھے۔ لیکن رہبانیت اور جوگی پن کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ ایک گھر میں آپ کو جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں چھت سے رسّی لٹک رہی تھی۔ دریافت کرنے پر لوگوں نے بتایا کہ فلاں عورت نے لٹکا رکھی ہے۔ وہ رات بھر عبادت کرتی ہے اور جب نیند کی شدت سے اونگھنے لگتی ہے تو اس سے لٹک جاتی ہے۔ آپنے رسّی کھلوا دی اور فرمایا کہ عبادت نافلہ بس اس وقت تک کرو جب تک نشاط طبع قائم رہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بڑے مرتاض زاہد تھے۔ انھوں نے عمر بھر روزہ رکھنے کا عہد کر لیا ——— رسُول اللہ صلعم کو معلوم ہوا تو ان کو بلوا بھیجا اور نصیحت فرمائی کہ "تم پر تمھارے جسم کا حق ہے، آنکھ کا حق ہے، بیوی کا حق ہے، مہینہ میں تین دن کے روزے کافی ہیں"۔ انھوں نے عرض کیا کہ ان میں اس سے زیادہ کی طاقت تھی، تب آپ نے فرمایا کہ اچھا تیسرے دن روزہ رکھا کرو، مگر انھوں نے کہا کہ "میں اس سے بھی زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں"۔ آپنے فرمایا کہ "ایک دن

ناغہ دے کر روزہ رکھا کرو"۔ انھوں نے پھر اصرار کیا مگر آپ نے اس سے زیادہ کی اجازت نہ دی۔

ایک دفعہ دو صحابیوں نے آکر عرض کیا کہ انھوں نے ترکِ حیوانات اور ترکِ نکاح کا عزم کر لیا تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "میں تو ان دونوں سے متمتع ہوتا ہوں"۔

کبھی کبھی آپ جائز حظوظِ دنیوی سے لطف اندوز بھی ہوا کرتے تھے لیکن امارت پسندی، تکلف اور نمائش سے ہمیشہ اجتناب فرماتے تھے، اور دوسروں کو بھی روکتے تھے۔

ایک روز آپ اپنی بیٹی حضرت فاطمہ زہرہ کے یہاں دعوت میں تشریف لے گئے تو وہاں آرائش کی خاطر دیواروں پر پردے لٹکے ہوئے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی آپ لوٹ آئے۔ حضرت علیؓ نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ "پیغمبر کو مناسب نہیں کہ زیب و زینت والے مکان میں جائے"۔

حضرت فاطمہ ہی کے گلے میں ایک بار سونے کا ہار دیکھا تو فرمایا "کیا تم کو برا نہ لگے گا جب لوگ کہیں گے کہ پیغمبر کی بیٹی کے گلے میں آگ کا ہار ہے"۔

ایلا[1] کے زمانہ میں حضرت عمر آپ کی قیام گاہ میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ

---

[1] ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کی ایک بات سے ناراض ہو کر دغابًا انکی تربیت کے لیے، ان سے علاحدگی اختیار کر کے ایک حجرہ میں الگ قیام فرمالیا تھا۔ اسی کو ایلا کا واقعہ کہا جاتا ہے۔ ایلا فقہ کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ ۱۲

جسم مبارک پر صرف ایک تہبند تھا، ایک کھُری چارپائی بچھی تھی، تکیہ میں درخت کی چھال بھری تھی، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے اور مشکیزہ کی کچھ کھالیں چھت سے لٹک رہی تھیں، حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ اس بے سروسامانی سے ان کو بہت رنج ہوا اور انھوں نے کہا "قیصر و کسریٰ تو عیش و عشرت کے مزے لوٹیں اور اللہ کے رسول کی یہ حالت ہو کہ بدن پر چارپائی کے بان کی بدھیاں پڑی ہوں"۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ "کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ وہ دنیا کا عیش لیں اور ہم آخرت کا عیش؟"

آپ "ضروری عمارت کے علاوہ ہر عمارت کو انسان کے لئے وبال" سمجھتے تھے۔ اکثر یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ "گھر میں ایک بستر اپنے لئے، ایک بیوی کے لئے اور ایک مہمان کے لئے ہونا چاہیئے۔ چوتھا اگر ہو تو وہ شیطان کا حصہ ہے"۔

مشرک و کافر، یہود و نصاریٰ سب کے ساتھ داد و دہش فرماتے تھے اور اگر معاملات میں اختلاف ہوتا تو مسلمانوں کا کبھی ناحق ساتھ نہ دیتے تھے۔

نجران کے عیسائیوں کا وفد مدینہ آیا تو آپ نے خود مہمان داری کی۔ وفد کے اراکین کو مسجدِ نبوی میں ٹھہرایا اور ان کو مسجد ہی میں اپنے طرز پر عبادت کرنے کی اجازت دے دی۔

ایک دفعہ ایک یہودی کو عام مجمع میں یہ کہتے ہوئے سُن کر کہ "قسم اس خدا کی جس نے موسیٰ کو تمام انبیاء پر فضیلت دی"۔ ایک صحابی سے ضبط نہ ہو سکا۔ انھوں نے پوچھا "ہمارے پیغمبر پر بھی؟"۔ یہودی نے کہا "ہاں" صحابی نے اسکے تھپڑ مار دیا۔ یہودی نے جاکر آپ سے شکایت کی۔ آپ نے ان صحابی کی سخت گرفت فرمائی۔

کچھ یہودیوں نے ایک روز شرارتاً آپ کے سامنے آکر السلام علیکم کے بجائے السام علیکم (یعنی تم کو موت آئے) کہا۔ حضرت عائشہ ان کو برا بھلا کہنے لگیں۔ آپ نے فوراً ٹوکا۔ "عائشہ، بد زبان نہ بنو، نرمی کرو، اللہ تعالیٰ ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے۔"

ابو بصرہ غفاری کا بیان ہے کہ جب وہ کافر تھے تو ایک بار مدینہ آئے اور آنحضرت صلعم کے مہمان ہوئے اور رات کو گھر کی تمام بکریوں کا دودھ پی گئے۔ آپ دیکھتے رہے لیکن کچھ نہ فرمایا۔ آپ کا کنبہ بھوکا رہا۔

خیبر میں ایک یہودن نے آپ کو کھانے میں زہر دیا، آپ کو زہر کا اثر محسوس ہونے لگا تو یہودیوں کو بلا کر تحقیقات کی۔ بالآخر انھوں نے اقبالِ جرم کر لیا لیکن آپ نے کسی سے کچھ تعرض نہ فرمایا (اگرچہ آپ پر اس زہر کا اثر آخر وقت تک رہا) جب اسی زہر سے ایک صحابی کا انتقال ہو گیا تب بھی آپ نے صرف اس یہودن سے ان کا قصاص لیا۔

عرب کے جاہل لوگ عورتوں پر بے دھڑک سختیاں کیا کرتے تھے۔ آپ نے عورتوں کے حقوق قائم کئے اور اپنے برتاؤ سے ان حقوق کو مستحکم بنا دیا۔

ایک خطبہ میں آپ نے مرد و عورت کے تعلقات کی بابت یہ فرمایا کہ:-

"لوگو! عورتوں کے حق میں میری نیکی کی وصیّت کو مانو۔ یہ تمھارے قبضہ اور تمھارے بس میں ہیں۔ تم سوا اس کے کسی اور بات کا حق نہیں رکھتے کہ اگر وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں تو ان کو خوابگاہ میں علیحدہ کر دو اور ان کو ہلکی مار مارو۔ اگر وہ تمھاری بات مان لیں تو پھر ان پر الزام دھرنے کے پہلو نہ ڈھونڈھو۔ بیشک تمھارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔ تمھارا حق تمھاری عورتوں پر یہ ہے کہ

وہ تمہارا بستر دوسروں سے پامال نہ کرائیں اور نہ تمہارے گھروں میں ان کو آنے کی اجازت دیں جن کو تم پسند نہیں کرتے۔ اور ان کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کو کھلانے اور پہنانے میں اچھا رویہ اختیار کرو۔

نکاح کے خطبوں میں عموماً قرآن کی یہ آیتیں پڑھا کرتے تھے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔ (بقرہ)	"عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔"
وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ (بقرہ)	"عورتوں کے حقوق مردوں پر وہی ہیں جو مردوں کے عورتوں پر اور مردوں کو عورتوں پر ایک منزلت حاصل ہے۔"
اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (نساء)	"مرد عورتوں پر بااختیار کئے گئے ہیں اس لئے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر فضیلت دی ہے اور مرد عورتوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔"

رہبانیت پسندی کے تحت تجرّد کی مذمت میں آپ نے فرمایا کہ "میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں تو جس نے میرے طریقہ سے روگردانی کی وہ مجھ سے نہیں۔"

ایک سفر میں آپ کی بیوی حضرت صفیہ آپ کے ساتھ تھیں۔ جب وہ سوار ہونے لگتیں تو آپ اپنا گھٹنا آگے بڑھا دیتے اور وہ اس پر پاؤں رکھ کر سوار ہو جاتیں ایک بار اونٹ کا پاؤں پھسلا اور آپ دونوں زمین پر گر پڑے۔ حضرت طلحہ مدد کو دوڑے۔ وہ پہلے آپ کی طرف متوجہ ہوئے تو آپ نے فرمایا "پہلے عورت

کی خبر لو"

ایک اور سفر میں اونٹوں کے کجاووں میں عورتیں سوار تھیں۔ ساربانوں نے چلتے چلتے حدی خوانی شروع کر دی۔ انکی آواز سے اونٹ بھڑکنے لگے تو آپ نے فرمایا کہ "دیکھو آبگینوں کو صدمہ نہ پہونچ جائے"۔

حضرت عائشہ کی بڑی بہن حضرت اسماء حضرت زبیر سے بیاہی تھیں حضرت زبیر جب مدینہ تشریف لائے تو انکی کل جائداد لے دیکر ایک گھوڑا تھا حضرت اسماء خود ہی اسکے لئے جنگل سے گھاس چھیل لاتیں، پانی بھرتیں اور کھانا پکاتیں ایک روز وہ سر پر کھجور کی گٹھلیاں لادے کہیں سے آرہی تھیں کہ آنحضرت صلعم اونٹ پر سوار اُدھر سے گذرے۔ انکو دیکھتے ہی آپ اونٹ پر سے اتر پڑے، انکو سوار کر دیا اور خود پیدل گھر تشریف لے گئے۔

قدیم عرب میں بیواؤں سے شادی کرنا عیب کی بات سمجھا جاتا تھا بعض ممالک میں اب بھی یہی دستور ہے۔ آنحضرت صلعم نے اسکی مخالفت میں عملی مثال پیش کی۔ آپ کی پہلی بیوی بھی ایک بیوہ خاتون تھیں اور بعد میں بھی آپنے جن محترم خواتین کو زوجیت کا شرف بخشا سوا حضرت عائشہ کے وہ سب بیوہ ہی تھیں۔

یتیموں پر آپ نہایت درجہ مہربان تھے۔ آپ کے لطف و کرم کو دیکھ کر صحابہ کرام بھی یتیموں کی سرپرستی کے آرزو مند رہتے تھے۔ بقول علامہ سید سلیمان ندوی ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا تھا۔ حضرت عائشہ اپنے خاندان اور انصار کے بچوں کو اپنے گھر میں لاڈ پیار سے پالتی تھیں اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے تو اصول ہی بنا لیا

تھا کہ کسی یتیم بچے کو شریک کئے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔

ایک دفعہ ایک یتیم نے آپکی عدالت میں ایک شخص کے خلاف ایک نخلستان کا دعویٰ کیا۔ لیکن قاعدہ کے مطابق اس کا حق ثابت نہ ہو سکا اس لئے آپنے وہ نخلستان مدعا علیہ ہی کا قرار دے دیا۔ یتیم بچہ فیصلہ سن کر رونے لگا۔ آپ کو اس پر اتنا ترس آیا کہ مدعا علیہ سے سفارش کی کہ وہ اپنی خوشی سے نخلستان اس بچہ کو دیدے۔ مگر وہ نہ مانا۔ ایک صحابی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے اپنے ایک باغ کے عوض وہ نخلستان خرید کر بچہ کو ہبہ کر دیا۔

ایک حدیث میں ہے کہ "مسلمانوں میں سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے بھلائی کیجاتی ہو اور سب سے برا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے بدسلوکی کی جاتی ہو۔"

عربوں کی جاہل قوم جانوروں کے حق میں بلا کی بیدرد تھی۔ زندہ اونٹ کی پیٹھ پر سے گوشت کا لوتھڑا کاٹ لیا کرتے تھے۔ جانوروں کو کھڑا کر کے تیر اندازی کی مشق کرتے تھے، جانوروں کا خون بھی پیا جاتا تھا۔ آپنے ان سب باتوں کو حرام قرار دیا۔

ایک دفعہ ایک اونٹ نظر سے گذرا جو بھوک سے بہت لاغر ہو گیا تھا آپنے فرمایا ——— "ان بے زبانوں کی بابت خدا سے ڈرو۔" اسی طرح ایک گدھے کو دیکھ کر جس کا چہرہ داغا گیا تھا زبان مبارک سے نکلا "جس نے اسے داغا ہے اس پر خدا کی لعنت ہو۔"

ل سیرۃ النبی، جلد ۶ صـ ۲۹۹

آپ نے اس سلسلہ میں یہ حکایت بھی بیان کی کہ ایک مسافر کو شدید پیاس معلوم ہوئی۔ پانی کا کہیں نشان نہ تھا۔ بڑی مشکل سے ایک کنواں ملا۔ اس نے اپنے چمڑے کے موزہ میں ڈور باندھ کر پانی بھرا اور پینے ہی والا تھا کہ اسکی نظر ایک کتے پر پڑی جو پیاس سے مر رہا تھا۔ اس نے وہ پانی کتے کو پلا دیا اور خود دوبارہ بھر کر پیا۔ یہ بات خدا کو اتنی پسند آئی کہ اس نے مسافر کو بخش دیا۔ صحابہ نے یہ سن کر پوچھا کہ کیا کتوں کے ساتھ ہمدردی کرنے پر بھی اجر ہے۔ آپ نے فرمایا ——— "ہاں ہر جاندار کے ساتھ حسن سلوک میں اجر ہے"۔

درخت لگانا آپ کو بہت پسند تھا۔ اسے ثواب کا کام فرماتے تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ "جس مسلمان نے کوئی درخت لگایا اور اسکے پھل کسی جانور یا انسان نے کھائے تو یہ لگانے والے کے لئے صدقہ ہوگا"۔

اپنی اولاد سے آپ بے انتہا محبت کرتے تھے۔ حضرت انس راوی ہیں کہ "میں نے کسی کو اپنے خاندان سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنی کہ آپ فرماتے تھے"۔

اپنے نواسوں یعنی حضرت حسنین رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ "یہ میرے گلدستے ہیں"۔ ایک بار آپ حضرت امام حسین رض کا منہ چوم رہے تھے ——— یہ دیکھ کر اقرع بن حابس نے کہا کہ "میرے دس بچے ہیں مگر میں نے تو آج تک کسی کا منہ نہیں چوما"۔ آپ نے ارشاد فرمایا "جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا"۔

جو واقعات اس جزو میں بیان کیے گئے انکی حیثیت محض مثال اور نمونہ کی ہے۔ ورنہ آپکی اخلاقی خوبیاں تفصیل سے بیان کرنے کے لئے بلا مبالغہ سیکڑوں اور ہزاروں

اوراق درکار ہیں۔

چھٹا مقالہ

پیغمبرِ اسلام اور تلوار

لا اِکراہَ فی الدِّین

(دین میں کوئی زبردستی نہیں)

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ روشنی کی کوئی کرن پھوٹی ہو اور تاریکی نے اُسے نگل جانے کی کوشش نہ کی ہو۔ دراصل کسی نئے تخیل یا تحریک کا جھٹلایا نہ جانا اور اس کی مخالفت نہ ہونا اسکی ناقابلِ تردید صداقت کی دلیل نہیں بسا اوقات اسکے پوچ اور لچر ہونے کا ثبوت ہوتا ہے۔

نور و ظلمت کی یہ کشمکش ابدی ہے۔ اس کشمکش میں ــــــ خواہ اس کا تعلق خود اپنے نفس و ضمیر سے ہو یا گرد و پیش کے ماحول اور کُل انسانی دنیا سے۔ نور کی حمایت اور ظلمت کی مخالفت میں اپنے امکان بھر حصّہ لینا، کوشش کرنا اور

ہر طرح کے ایثار کے لئے تیار رہنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس فرض کو اسلامی اصطلاح میں جہاد کہتے ہیں۔

اسلام ویسے تو ابتدا ہی سے مختلف غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کا نشانہ رہا ہے لیکن اسکی جس چیز نے معترضوں کی جبینوں پر سب سے زیادہ شکنیں ڈالی ہیں اور انکی زبانوں اور قلموں کی جنبش میں لانے کا قوی ترین سبب ہوئی ہے وہ یہی جہاد کا تصور ہے۔ اکثر غیر مسلم حلقوں میں اس بات کو باور کرنے کا شعوری یا غیر شعوری رجحان پایا جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار لے کر اپنے دین کی تبلیغ کی اور یہ کہ آپ کی دینی جدوجہد درحقیقت ملک گیری وجہانبانی کا ایک بہانہ تھی جو وقت کے مزاج کے مطابق ہونے کے باعث اپنے اصل مقصد میں خوب کامیاب ہوئی۔ چنانچہ "دی نیو ایجوکیٹرز انسائیکلوپیڈیا" (THE NEW EDUCATOR'S ENCYLOPAEDIA) جیسی اہم اور مستند کتاب بھی اس بے بنیاد بیان کی حامل ہے کہ "جب محمدؐ کے پیرووں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا تو انھوں نے اپنے عقائد بزور شمشیر منوانے کی ٹھانی (اور) جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ (بالآخر انھوں نے) پورا ملک عرب فتح کر ڈالا۔"[1]

یہاں جہاد کے نظریہ کی تھوڑی سی تشریح ضروری ہے۔ جہاد کے معنی عموماً جنگ اور قتال کے سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے۔ اسکے اصلی معنی محنت اور کوشش کے ہیں۔ جہاد کا اصطلاحی مفہوم بیان کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی

---

[1] صفحہ ۲۳۷۵

نے لکھا ہے کہ :۔ "حق کی بلندی اور اسکی اشاعت اور حفاظت کے لئے ہر قسم کی جدوجہد، قربانی اور ایثار گوارا کرنا اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں اس راہ میں صرف کرنا یہاں تک کہ اسکے لئے اپنی، اپنے عزیز و قریب کے اہل و عیال کی، خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا، انکی تدبیروں کو رائیگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا اور اس کے لئے جنگ کے میدان میں، اگر ان سے لڑنا پڑے، تو اسکے لئے بھی پوری طرح تیار رہنا۔"[۱]

تاریخ سے ذرا بھی رسم و راہ رکھنے والوں کو غالباً اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں دشواری نہ ہو کہ کوئی تحریک محض اپنے پیغام کی حقانیت یا اصولوں کی پاکیزگی کی بنا پر کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کے پیچھے عیش و آرام اور جان اور مال کو داؤں پر لگا دینے والوں کی ایک جماعت نہ ہو اور اگرچہ یہ درست ہے کہ کسی تحریک کی کامیابی اسکی صداقت اور افضلیت کا ثبوت نہیں ہے، مبارک سے مبارک تحریک کامیابی کا منہ، اپنے پیرووں میں مجاہدانہ ذوق پیدا کئے بغیر نہیں دیکھ سکتی۔

فطرت کا یہ راز دنیا نے آنحضرت صلعم ہی کی وساطت سے جانا اور آپ ہی کی بدولت آپ کی امت میں اعلیٰ مقاصد کی خاطر مادی سود و زیاں کے حدود سے گزر جانے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ یہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال ہی کے تصورات تھے جنھوں نے مسلمانوں کو مکہ میں سخت ترین مظالم کو برداشت کرنے کا کلیجہ عطا کیا۔

---

[۱] سیرۃ النبی جلد ۵، صفحہ ۲۹۶

وہ تپتی ہوئی ریگ پر لٹائے گئے، ان کے جسم دہکتے ہوئے لوہے سے داغے گئے، ان کے گلوں پہ تلواریں چلیں، تیروں کی ان پر بارش ہوئی، بھوک اور پیاس سے آزمائے گئے مگر ان کے عزم واستقلال میں ترقی ہی ہوتی گئی، پھر وطن اور عزیز واقارب سے منہ موڑ کر حبش اور مدینہ کا رخ کرنا پڑا تو کسی کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی۔ دورِ نبوت کے آخری دس سال مسلمانوں نے مدینہ میں جس طرح تلواروں کے سایہ میں بسر کئے وہ بھی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے جہاد کے معنی صرف تیر و تفنگ ہی کے ذریعہ کوشش کرنے کے نہیں ہیں بلکہ تمام نیک کاموں کے لئے تمام جائز طریقوں سے سعی کرنا اس کے تحت میں داخل ہے۔ چنانچہ خود اپنے نفس کے خلاف سعی کرنے کو سب سے بڑا جہاد بتایا گیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک بار آنحضرت صلعم نے میدانِ جنگ سے لوٹ کر آنے والے صحابہ کا ان الفاظ سے استقبال کیا کہ "تمہارا آنا مبارک! تم چھوٹے جہاد (جنگ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو۔ بڑا جہاد بندہ کا اپنے نفس سے لڑنا ہے[۱]۔" ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لئے اپنے نفس اور اپنی خواہشوں سے جہاد کرو[۲]۔"

اسی طرح تحصیل علم بھی ایک جہاد ہے کیوں کہ اس سے ظلمت کی پسپائی ہوتی ہے۔ جو ایمان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ بعض علماء نے تو اس جہاد کو جہاد بالنفس اور جہاد بالمال پر ترجیح دی ہے۔ اسلام کی عظیم الشان ترقی کا راز دراصل "قرآن اور تلوار"

---

[۱] ماخوذ از سیرۃ النبی، جلد ۵، صفحہ ۲۰۰ [۲] ایضاً

میں نہیں بلکہ قرآن کی تلوار میں تلاش کرنا چاہئیے۔

فلا تطع الکافرین وجاھدھم — "تو کافروں کی باتوں میں نہ آ،

بہ جہاداً کبیراً — اور قرآن کے ذریعہ ان سے جہاد کر،

بڑا جہاد" (القرآن۔ فرقان)

اور ظلم، افلاس، بیماری، توہم پرستی، عصبیت اور تمام دوسرے جسمانی داخلاقی وروحانی مصائب ومعائب کے خلاف محنت وسعی بلیغ جہاد کا مرتبہ رکھتی ہے۔ ایک ارشاد نبوی یہ بھی ہے کہ :۔ "ایک بڑا جہاد کسی ظالم قوت کے سامنے انصاف کی بات کہدینا ہے"[۱]

ایک صحابی یمن سے سفر کر کے مدینہ آئے اور دربار رسالت میں حاضر ہوکر لشکر اسلام میں شامل کئے جانے کی خواہش کی۔ آپنے ان سے دریافت فرمایا "تمھارے والدین زندہ ہیں یا فوت ہوگئے"؟ انھوں نے بتایا کہ زندہ تھے۔ ارشاد ہوا "تو پھر تم ان ہی کی خدمت میں جہاد کرو"[۲] گویا خدمتِ والدین بھی جہاد ہے۔

عورتوں نے ایک بار جہاد میں شرکت کی اجازت مانگی تو انھیں جواب ملا کہ "تمھارا جہاد نیک حج ہے"[۳]

زندگی نرم بھی ہے اور گرم بھی، یا شاعر کی زبان میں "شاخِ گل" بھی ہے اور "تلوار" بھی۔ انسان کو نرم وگرم دونوں قسم کے اخلاق کی حاجت ہے۔ حلم اور رحم، صبر اور ضبط، عفو اور درگذر بڑی خوبصورت صفتیں ہیں مگر زندگی کے ہر نشیب وفراز

---

[۱] ترمذی [۲] ابوداؤد [۳] صحیح بخاری

میں تو یہ دستگیری نہیں کر سکتیں۔

فراوڈے (FROUDE) نے خوب کہا ہے کہ "تحمل اپنی جگہ پر ایک اچھی چیز ہے لیکن تم اسکو تو برداشت نہیں کر سکتے جو تم کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے اور تمھاری گردن قلم کر دینے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔"

پھر یہ ضروری نہیں ہے کہ ضبط و تحمل کے پیچھے ہمیشہ عقل و شرافت ہی کے عناصر ہوں۔ یہ کیفیات مختلف دماغی و اخلاقی عوامل کے نتیجہ میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ گبن (GIBBON) نے اس پہلو پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " ایک تحمل فلاسفر کا ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں سچے ہیں۔ دوسرا مورخ کا ہے جس کی نظر میں سب یکساں جھوٹے ہیں۔ تیسرا سیاست داں کا ہے جو کل کو یکساں مفید سمجھتا ہے۔ ایک تحمل اس شخص کا ہے جو مختلف نظریوں اور طریقوں کو اس بنا پر برداشت کرتا ہے کہ وہ خود تمام نظریوں اور طریقوں سے مطلق بے نیاز ہو چکا ہے۔ پھر ایک تحمل اس کمزور آدمی کا بھی ہے جو اپنی کمزوری کے باعث ان بزرگوں یا باتوں کی ہر طرح کی توہین و تحقیر برداشت کرنے پر مجبور ہے جنھیں وہ بہت عزیز رکھتا ہے۔"

چنانچہ نرم اخلاق نہ تو ہر حال میں کریم النفسی کا پَرتَو ہیں اور نہ ہی تمام موقعوں پر زندگی کی باگ ڈور ان کے حوالے کی جا سکتی ہے۔ مشہور انگریز مفکر ہابس (HOBBES) کی رائے میں " فطرت کا اولین قانون یہ ہے کہ امن کو تلاش کیا جائے اور اسکی راہ پر چلا جائے اور دوسرا جو کہ فطرت صالحہ کا خلاصہ ہے یہ کہ ہر ممکن طرح سے ہم اپنی حفاظت کریں۔"

اسی نقطۂ نظر کی حمایت میں آسٹریلوی مدبر آر، جی، کیسے (R.G CASEY)

نے اپنی کتاب " این آسٹریلین اِن انڈیا" (AN AUSTRALIAN IN INDIA) میں گاندھی جی کے تصوّر عدم تشدّد پر تنقید کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ یہ تو میری سمجھ میں آسکتا ہو کہ میں دوسروں کیخلاف تشدد نہ اختیار کروں لیکن دوسروں کو میں اپنے خلاف تشدد اختیار کرنے سے کیسے باز رکھ سکتا ہوں؟" یعنی دوسرے الفاظ میں عدم تشدد کا نظریہ ایک ناکافی اور نامکمل نظریہ ہے اور اسکے سانچے پر افراد یا اقوام کی زندگیوں کو نہیں ڈھالا جا سکتا۔

ہر فرد اور ہر جماعت کی زندگی میں کچھ مواقع ایسے آتے ہیں کہ اُسے حلم، عفو اور اہنسا کے علاوہ ان کے برعکس اخلاقی اوصاف کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ سقراط سے ایک بار دریافت کیا گیا کہ "کیا انسان کو جنگوں سے نجات نہ مل سکے گی؟" تو اس نے جواب میں کہا کہ "جنگیں اس وقت تک ناگزیر رہیں گی جب تک انسان دیوانگی میں مبتلا رہے گا" اس پر لوگوں نے سوال کیا۔ "اور انسان کب تک دیوانگی میں مبتلا رہے گا" سقراط نے کہا "ہمیشہ"۔

خواجہ کمال الدین نے "آئیڈیل پرافٹ" (THE IDEAL PROPHET) میں لکھا ہے کہ ——— " مذاہب اور ممالک کی تواریخ سے یکساں طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تلوار کو کبھی بالائے طاق نہیں رکھا گیا ہے۔ ہندو اوتاروں اور اسرائیلی سرداروں نے اسے بے نیام کیا کیونکہ نہ تو اسرائیلی قانون اور نہ ہندو دھرم کسی معنوں میں اہنسا کا پرچار کرتا ہے۔ امن کے شاہزادہ کا بھی یہی اعلان تھا کہ وہ دنیا کو امن نہیں بلکہ تلوار دینے آیا تھا۔ وہ قانون اور پیغمبروں (کے کاموں) کو پورا کرنے آیا تھا۔ اسکے مذہب کے اصول تلوار کے استعمال کی اجازت دیتے تھے۔ اور اسکے (سلسلہ کے) پیغمبروں نے جنگیں لڑی تھیں۔ درحقیقت وہ تلوار ضرور اٹھاتا۔

اگر مناسب اور موافق موقع پیش آتا، مگر ایسا نہ ہوا۔ اور اگر اس نے پطرس کو تلوار بے نیام کرنے سے باز رکھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ وقت نامناسب تھا، اور تشدد کے استعمال سے اس کو اور اسکے پیرووں کو زیادہ نقصان پہونچ جاتا اسکے علاوہ جو حضرت عیسیٰ خود نہ کر سکے وہ ان کے پیرووں نے پوری مستعدی اور تندہی سے کر ڈالا ہے، اور اس طرح ان کے الفاظ کی صداقت خطرناک انداز میں ثابت کر رہے ہیں۔ مسیحیہ دکرائسنڈم کے مادی اور ذہنی وسائل کا بہت بڑا حصہ ان ذرائع کی ایجاد میں صرف ہو رہا ہے جو ساری دنیا کو بہترین طور پر آگ اور تلوار کے حوالے کر سکیں"۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو تلوار کا صحیح استعمال بتایا۔ بعض صورتیں یقیناً ایسی ہوتی ہیں جن میں ہتھیار اٹھانا ایک اخلاقی ضرورت بن جاتا ہے۔ مثلاً جب آزادی پر چوطرفہ حملے ہونے لگیں یا عبادت گاہیں خطرہ میں پڑجائیں یا ابنِ آدم کی آبرو اور جان اور مال کی کوئی قیمت نہ رہ جائے تو محض تماشائی بن کر تو نہیں دیکھا جا سکتا۔ لیکن بدقسمتی سے تلوار کا استعمال اکثر غلط ہی ہوا ہے خدا کے رسول کا اس طرح یہ فرض تھا کہ وہ امن و جنگ کے موقعوں کو الگ الگ کر کے دکھائے۔ اور دنیا کی ہدایت کے لئے میدانِ جنگ کے اخلاقیات کا بھی ایک مکمل اور جامع دستور العمل بہم پہونچائے۔

۲

اسلام نے حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لئے جنگ کرنا جائز قرار دیا ہے اور آنحضرت صلعم کو بھی مجبور ہو کر تلوار سے کام لینا پڑا، مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ

اسلام کی کامیابی کی کہانی درحقیقت جنگ وجبر کی کہانی ہے اور لشکر کشی کا اصل مقصد یہ تھا کہ دین کی آڑ لے کر سلطنت وحکومت کی ہوس پوری کی جائے محض بہتان اور تاریخ کو جھٹلانے کی ایک گندی سازش ہے۔

اسلام ایک استدلالی اور عقلی مذہب ہے۔ اس کے تبلیغ ودعوت کے اصول حکمت اور دانشمندی، وعظ اور نصیحت اور بحث ومباحثہ پر قائم ہیں۔ پیغمبر اسلام پر جو صحیفۂ ربانی نازل ہوا اس نے عقل انسانی کو مخاطب کیا اور غور وفکر وفہم وتدبر کی دعوت دی۔ پھر جو مذہب اپنی اشاعت کے لئے دعوت وتبلیغ کا راستہ اختیار کرتا ہو اور سوچنے اور سمجھنے کا لوگوں سے مطالبہ کرتا ہو وہ کیونکر جبر اور زبردستی کی تدبیریں کام میں لا سکتا ہے۔ اسلام نے صرف یہی نہیں کیا کہ دین کی جبری اشاعت کی مذمت کی بلکہ اس نے یہ نکتہ بھی سمجھایا کہ مذہب رضا ورغبت کی چیز ہے اس کا تعلق قلب وروح سے ہے اور قلب وروح کو زور شمشیر تسخیر نہیں کیا جا سکتا۔ ایمان دراصل یقین کا دوسرا نام ہے اور دنیا کی زبردست سے زبردست طاقت جبراً کسی کمزور سے کمزور انسان کے دل میں بھی یقین کا ایک ذرہ نہیں پیدا کر سکتی۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ (سورہ کہف)	اور کہدے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ تو جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے"
لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (سورہ بقرہ)	"دین میں کوئی زبردستی نہیں حقیقت گمراہی سے الگ ہو چکی"

نبی کا کام لوگوں کو حقیقت سے روشناس کرا دینا ہے۔ اسکو زبردستی منوانا نہیں۔

اِنَّمَا عَلیٰ رَسُولِنَا البَلاغُ المُبِین (مائدہ)	"ہمارے نبی پر یہی فرض ہے کہ وہ صاف صاف ہمارا پیغام پہونچا دے"
اِنَّمَا اَنْتَ مُذَکِّرٌ لَسْتَ عَلَیْهِم بِمُصَیْطِر (غاشیہ)	"اے پیغمبر! تو صرف نصیحت کرنے والا ہے تو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا"
فَاِنْ اَعْرَضُوا فَمَا اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِم حَفِیْظًا اِنْ عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلاغُ (شوریٰ)	"پھر اگر وہ اسلام سے انکار کریں تو اے پیغمبر ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔ تیرے ذمہ صرف پیغام کو پہونچا دینا ہے"

اگر خدا کو دین کی بجبر اشاعت ہی منظور ہوتی تو وہ یقیناً اس پر قادر تھا کہ تمام لوگوں کو مسلمان بنا دیتا لیکن اس کی حکمت اور مصلحت یہ ہے کہ اس کے بندوں کو مذہب کے معاملہ میں پوری آزادی ہو اور عقل اور بصیرت والے چشمہ نور سے فیضیاب ہوں اور نافہم محروم رہیں۔

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْن (یونس)	"اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ (لوگوں کو زبردستی مومن بنا دے) تو زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے تو کیا پیغمبر تو لوگوں پر زبردستی کریگا کہ وہ ایمان لے آئیں۔

قرآن مجید میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان

بنانے کا حکم دیا گیا ہو۔ قرآن کی ہدایت اس کے بالکل برعکس ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ	"اور اگر (لڑائی میں) کوئی
اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى	مشرک تجھ سے پناہ کا طالب ہو تو
يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ	اس کو پناہ دے یہاں تک وہ خدا کا
مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ	کلام سن لے پھر اس کو وہاں پہنچا دے
لَّا يَعْلَمُوْنَ	کہ جہاں وہ بالکل بےخوف ہو کر رہ سکے
(توبہ)	کہ یہ لوگ بےعلم ہیں"

اور نہ آنحضرت صلعم کی سیرت ہی میں کوئی واقعہ ایسا ملتا ہے جو دین کی جبری اشاعت کی طرف اشارہ کرتا ہو۔ اس کے برخلاف نرمی حسن خلق، صداقت و سخاوت عفو و حلم کے ذریعہ پتھر کو موم بنا دینے کے لاتعداد واقعات البتہ آپ کے صحیفۂ حیات کے تمام اوراق میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مثلاً غزوہ خیبر کے دوران میں جب آپ نے علم خاص حضرت علیؓ کو عنایت فرمایا تھا تو انھوں نے دریافت کیا کہ "کیا یہودیوں کو لڑ کر مسلمان بنا لیں" آپ نے فرمایا "نرمی کے ساتھ ان کے سامنے اسلام پیش کرو۔ اگر ایک شخص بھی تمھاری ہدایت پر ایمان لے آئے تو یہ سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔"

اسی طرح جب فتح مکہ کے بعد آپ نے حضرت خالد کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا تو صاف ہدایت کر دی تھی کہ صرف دعوتِ دین مقصود ہے جنگ نہیں۔ اور جب اسکے باوجود حضرت خالد نے تلوار سے کام لیا تو آپ نے سخت ناپسند کیا اور قبلہ رو کھڑے ہو کر فرمایا کہ "اے خدا! خالد نے جو کچھ کیا اس کی

ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔" پھر آپ نے خون بہا ادا کرنے کے لئے حضرت علی کو روانہ فرمایا اور انھوں نے ایک ایک بچہ کا یہاں تک کہ کتوں کا بھی خوں بہا ادا کیا[1]۔

اسلام اور تلوار کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کارلائل (THOMAS CARLYLE) نے لکھا ہے کہ "محمد (صلعم) کے تلوار کے زور سے اپنے دین کی اشاعت کرنے کا بہت چرچا کیا گیا ہے .... تلوار بیشک! مگر تم کو تلوار ملے گی کہاں؟ ہر نیا خیال اپنی ابتدائی منزل میں ایک کی اقلیت میں ہوتا ہے وہ صرف ایک ہی شخص کے ذہن میں نشو و نما پاتا ہے۔ دنیا بھر میں صرف ایک ہی شخص اس پر یقین رکھتا ہے اور تنہا وہ ایک شخص تمام اشخاص کے مقابل ہوتا ہے۔ اس شخص کا تلوار ہاتھ میں لے کر اسکی اشاعت کرنے لگنا کچھ بھی مفید نہ ہو سکے گا[2]۔"

قتل و غارت، خونریزی اور بدامنی سے زیادہ خدا کو کوئی چیز ناپسند نہیں ہے۔ قرآن کی تعلیم کے مطابق رسولوں کی بعثت کا ایک خاص مقصد دنیا میں امن و امان کا قیام اور جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا انتظام بھی تھا۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى	"اسی لئے ہم نے بنی اسرائیل
بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ	کو لکھ دیا تھا کہ جس شخص نے ایک
نَفْسًاۢ بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ	جان کو بغیر بدلے یا زمین میں فساد کے

---

[1] تاریخ طبری جلد ۳ [2] آن ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ صفحہ ۶۱

فکانما قتل الناس جمیعاً | قتل کیا اس نے گویا سارے
(مائدہ) | عالم کو قتل کر ڈالا۔"

واذا تولیٰ سعیٰ فی الارض | "اور جب وہ پھر کر جاتا ہے
لیفسد فیہا ویہلک | تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد
الحرث والنسل واللہ | برپا کرے اور کھیتی اور نسل برباد کرے
لا یحب الفساد (بقرہ) | اور اللہ فساد کو پسند نہیں۔"

ولا تقتلوا النفس التی | "خدا نے جس جان کو حرام کیا ہے
حرم اللہ الا بالحق (بنی اسرائیل) | اس کو ناحق نہ مارو۔"

اسلام میں نیک و بد کی تشخیص صرف علم و عقیدہ تک محدود نہیں ہے۔ وہ بدی کے استیصال اور نیکی کی نصرت کی خاطر عملی جد و جہد کا بھی مطالبہ کرتا ہے اس کی تدبیریں بتاتا ہے اور اس سلسلے میں احکام صادر کرتا ہے۔ اسلام کا عملی اسلوب فکر انسانی کمزوریوں کو نظر انداز کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہ کمزوریاں ہمیشہ صرف پند و نصیحت ہی کے ذریعہ مٹائی یا دبائی نہیں جا سکتی ہیں بعض اوقات امن کا مقصد بھی جنگ کے بغیر حاصل نہیں ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم کے سامنے بھی ایسے مواقع آئے جب تلقین و وعظ کے ساتھ زور بازو سے بھی کام لینا ناگزیر ہو گیا۔ اور اگر ان صورتوں میں بھی آپ خونریزی سے احتراز فرماتے تو دنیا کے لئے ایک ایسی مثال چھوڑ جاتے جس پر اوّل تو عمل کرنا ممکن ہی نہ ہوتا اور اگر بفرض محال وہ عامل ہو بھی جاتی تو چند ہی صدیوں میں اس کی شکل ایسی مسخ ہو جاتی کہ تہذیب تمدن کا کھاڑ ڈھونڈھنے

پر بھی نظر نہ آتا۔

اسلام جنگ کی اجازت دیتا ہے مگر صرف ایک عمل جراحت کی طور پر یعنی ایک ایسی رکاوٹ کو دور کرنے کی غرض سے جو معمولی تدابیر سے دفع نہ ہو سکے۔ گویا جنگ ایک ناپسندیدہ ضرورت ہے۔ ایک بلند اور مستحسن مقصد کے حصول کی آخری تدبیر۔ اس طرح اسلام جنگ کو بہیمانہ کشت و خون کی سطح سے اٹھا کر عبادت کے مقام پر پہونچا دیتا ہے۔ جو جنگ اس عظیم اور ارفع معیار پر نہ آسکے وہ سراسر قابل نفرت اور رسوائی کا باعث ہے۔

۳

جنگ تمام انسانی افعال میں بلاشبہ سب سے زیادہ بہیمانہ فعل ہے۔ جنگ کے میدان میں انسان اپنی اشرف المخلوقات کی خلعت اتار کر رکھ دیتا ہے اور جنگلی درندوں کا جامہ پہن لیتا ہے۔ لیکن چونکہ آنحضرت صلعم ایک مقدس فرض ہی کے طور پر تلوار اٹھانا جائز سمجھتے تھے اس لئے آپنے تمام وحشیانہ طریقوں کی ممانعت کر دی اور ایسی اصلاحیں جاری فرمائیں کہ سفاکی، بیدردی اور درندگی کی جگہ عدل و رحم کے جذبات میدان جنگ کے بھی اوصاف بن گئے۔

اچانک حملہ کر بیٹھنا یا حملہ آوری میں پیش دستی کرنا جنگی قیادت کا بہترین عنصر زمانہ قدیم میں بھی سمجھا جاتا تھا اور آج بھی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن آنحضرت صلعم کا دستور اس کے خلاف تھا اور اس میں آپ کی مصلحت صرف یہی نہیں تھی کہ مسلمانوں پر میدان جنگ میں پیش قدمی کرنے کا الزام نہ آنے پائے بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم یہ نکتہ بھی ملحوظ ہوتا تھا کہ دشمن کو جنگ و امن کے مسئلہ کے تمام

پہلوؤں پر غور کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے اور اگر آخری لمحہ میں بھی وہ صلح کو جنگ پر ترجیح دینا چاہے تو کوئی چیز مانع نہ ہو۔

چنانچہ جن غزوات میں اسلامی افواج کی قیادت آپ خود فرما رہے ہوتے تھے ان میں میدانِ جنگ میں صفیں آراستہ کرنے کے بعد آپ کل مجاہدین کو صاف حکم دیدیتے تھے کہ جب تک دشمن کی فوجیں بالکل قریب آجائیں اپنی جگہ سے کوئی نہ بڑھے۔ اور جن مہموں میں آپ خود شریک نہ ہوتے تھے ان میں بھی افواج کو رخصت کرتے وقت آپ اسی قسم کی ہدایات فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً ۱۰ھ میں حضرت علی تین سو سواروں کے ساتھ عازم یمن ہوئے تو رسول اللہ صلعم نے ان سے فرمایا کہ "جب تم وہاں پہونچ جاؤ تو جب تک تم پر کوئی حملہ نہ کرے تم نہ لڑنا"[۱]۔ اسی طرح حضرت معاذ بن انس سے روایت ہے کہ "میں فلاں غزوہ میں آپ کے ساتھ تھا لوگوں نے دوسروں کے پڑاؤ پر جاکر تنگ کیا اور لوٹ مار۔ آپ نے ایک شخص کو بھیجا جس نے منادی کردی کہ جو دوسروں کو ان کے گھروں میں تنگ کرے یا لوٹے مارے اس کا جہاد قبول نہیں"[۲]۔

یہ ایک پرانا مقولہ ہے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے مگر جس کا فرض زندگی کے ہر شعبہ میں جائز و ناجائز کی دائمی تجدید ہو اس کی نظر میں اس طرح کے شاعرانہ مقولے کچھ وقعت نہیں پا سکتے ہیں۔ آنحضرت صلعم نے جنگ میں ضعیفوں، عورتوں، بچوں، ملازموں اور غلاموں کے قتل کی قطعی ممانعت کردی تھی

---

[۱] ماخوذ از سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۲۰۵ [۲] ایضاً صفحہ ۲۱۳

اور جب مسلمانوں کی فوجیں غنیم کی آبادیوں میں داخل ہوتی تھیں تو انھیں عام طور پر یہ حکم دیدیا جاتا تھا کہ جو لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں یا کسی اور طریقہ سے مقابلہ میں نہ آنے کا ارادہ ظاہر کردیں انھیں مکمل امان دیا جائے۔

اسی طرح خلیفۂ اول حضرت ابوبکر نے کبھی جب شام کی طرف فوج روانہ کی تو اسکے نام یہ تاریخی فرمان جاری کیا کہ "دشمنوں سے تمھارے معاہدوں میں جھوٹ یا فریب نہ ہونا چاہئیے۔ ہر معاملہ میں ایماندار رہو تاکہ تمھاری صداقت اور اعلیٰ ظرفی ثابت ہوجائے۔ اپنے وعدوں اور اپنی باتوں کی سختی کے ساتھ پابندی کرو۔ راہبوں اور سنیاسیوں کے سکون میں خلل نہ ڈالو۔ اور ان کے مسکنوں کو مسمار نہ ہونے دو۔"[۱]

اس فرمان کے متعلق مشہور انگریز مصنف باسورتھ اسمتھ (BOSWORTH SMITH) تحریر کرتے ہیں کہ — "ابوبکر نے شام میں اپنی فوجوں کو حکم دے دیا تھا کہ نہ تو مردوں کے چہرے بگاڑیں، نہ بڈھوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کریں، نہ پھلدار درختوں کو گرائیں اور نہ ان کے جانوروں کو ماریں علاوہ اس کے کہ کھانے کے لئے ضرورت ہو، اور ان کریمانہ اصولوں نے مسلمانوں کی ساری جنگی تاریخ میں جنگی ضوابط کا کام دیا۔"[۲]

اور فنلے (FINLAY) نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "اس نے یہودیوں

---

[۱] طبری جلد ۲ [۲] ماخوذ از — اسلام اینڈ سویلائیزیشن (ISLAM AND CIVILISATION) مصنفہ خواجہ کمال الدین صفحہ ۷۵

اور عیسائیوں کو انصاف وحلم اور بردباری کے ایسے اصولوں کا مژدہ سنایا جن پر نہ تو رومی شہنشاہوں اور نہ سخت عقیدہ پادریوں اور پوپوں نے کبھی عمل کیا تھا۔"[1]

یہاں ایک نظر دشمنوں کے ساتھ سلوک کے اس انداز پر بھی ڈال لینا چاہیئے جس کی تعلیم یہود کی شریعت میں پائی جاتی ہے۔ اور جس پر انکا عمل تھا۔ کتاب توراۃ کے باب متی کی یہ سطریں ملاحظہ ہوں:۔

"بنی اسرائیل نے مدیاں کی عورتوں اور بچوں کو اسیر کر لیا۔ ان کے مویشی اور بھیڑ بکری اور مال ومتاع سب لوٹ لیا اور ان کے سارے شہروں کو جن میں وہ رہتے تھے اور ان کے تمام قلعوں کو پھونک دیا۔" (۹۔۳۱)

"تم ان کے کل بچوں کو قتل کر دو اور ہر عورت کو جو مرد کی صحبت سے واقف ہو چکی ہے جان سے مار دو۔" (۱۸-۳۱)

"لیکن وہ لڑکیاں جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لیے زندہ رکھو۔" (۱۹-۳۱)

نیز ہندوؤں کی مقدس کتاب رگ وید کے ان چند اقتباسات کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"اس نے پچاس ہزار سیاہ فام دشمنوں کو لڑائی میں موت کے گھاٹ اتارا۔" (منڈل ۴۔ منتر ۱۶)

"ہم نے داسوں (غلاموں) کے جسموں کو دو حصوں میں قطع کر ڈالا۔

---

[1] فنلے۔ گریس انڈر دا رومنس صفحہ ۳۶۷ (GREECE UNDER THE ROMANS)

قضا و قدر نے ان کو اسی لئے پیدا کیا تھا۔" (منڈل ۱۰۔ منتر ۴۹)
"وہ اندر اجس نے ورترا کو قتل کیا اور قصبے کے قصبے اور گاؤں کے گاؤں تہ و بالا کر ڈالے۔" (منڈل ۲۔ منتر ۲۰)

اسیرانِ جنگ پر ظلم کے پہاڑ توڑنا اس زمانہ کی تمام قوموں میں ایک معمولی بات تھی۔ عرب بھی اس میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ آنحضرت صلعم نے ان کی بابت تاکید کی کہ عزّت و عافیت کے ساتھ رکھے جائیں۔

مسلمانوں کو سب سے پہلے جنگ بدر میں قیدی ہاتھ آئے تھے۔ یہ لوگ اہلِ مکّہ تھے اور ان کی اسلام دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جنھوں نے اپنے ہاتھ اور زبان سے خود رسول اللہ صلعم اور اکثر اکابر کو مختلف قسم کی اذیتیں پہونچائی تھیں۔ چنانچہ آپ نے مناسب جانا کہ ان کے معاملہ میں صحابہ سے مشورہ کر لیا جائے۔ صحابہ میں رائے کا اختلاف ہوا۔ ایک گروہ حضرت ابوبکر صدیق کا ہمخیال تھا جن کی رائے تھی کہ قیدیوں کو جرمانہ لے کر آزاد کر دیا جائے۔ مسلمانوں کو جنگی ساز و سامان کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ جرمانہ کی رقم اس سلسلہ میں بہت مفید ہو سکتی تھی۔ اسکے علاوہ رہا ہونے کے بعد اکثر قیدیوں کے ایمان لے آنے کا بھی امکان تھا۔ صحابہ کا دوسرا گروہ حضرت عمر فاروق کی اس تجویز سے متفق تھا کہ کل قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے کیونکہ وہ سب کے سب کفر اور شرک کے امام اور پیشوا تھے۔ نہ جانے کتنے مسلمانوں کا خون ان کی گردنوں پر تھا۔ اب موقع تھا کہ ان معصوم شہدا کا قصاص لیا جائے۔ حضرت ابوبکر کی رائے چونکہ نرم دلی پر مبنی تھی اسلئے رحمۃ للعالمین کو وہی پسند آئی آپ نے

حکم دیا کہ قیدیوں میں سے جو جرمانہ ادا کر دیں وہ رہا کر دیئے جائیں اور جو مقدرت نہ رکھتے ہوں انھیں مدینہ لے چلا جائے۔ مدینہ پہونچ کر جب یہ قیدی صحابہ کے حوالہ کئے گئے تو آپ نے تاکید فرما دی کہ ان کو کھانے پینے یا کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ انہی قیدیوں سے روایتیں ہیں کہ صحابہ خود کھجور وغیرہ کھا کر بسر کر لیتے تھے اور ان کو کھانا کھلاتے تھے۔

غزوہ حنین میں چھ ہزار اسیر مسلمانوں کے قبضہ میں آئے تھے۔ آپ نے ان سب کو بلا معاوضہ رہا فرما دیا اور ان کے پہننے کے لئے چھ ہزار جوڑے عنایت فرمائے۔ اسیران جنگ کی غیر مشروط رہائی کا یہ کوئی تنہا واقعہ نہ تھا۔ سیرت پاک میں اس طرح کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔

قاضی سلیمان منصور پوری کا کہنا ہے کہ احادیث کی کتابوں میں ایک واقعہ قیدیوں کے تبادلہ کا بھی پایا جاتا ہے[۱]۔ گویا آپ نے چودہ سو برس قبل ایک ایسے معاملہ کو قابل عمل ثابت کر دیا تھا جس پر کامیابی کے ساتھ عمل پیرا ہونا آج کی مہذب ترین قوموں کے لئے دشوار ہو رہا ہے۔

دوران جنگ میں دشمن کے مال واسباب کو لوٹنے کا رواج عام تھا۔ آنحضرت صلعم نے اسکو بھی ناجائز قرار دیا۔ ابوداؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ہم لوگ ایک مہم پر گئے ہوئے تھے کہ تنگدستی کے ہاتھوں سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ راستہ میں اتفاق سے بکریوں کا ایک ریوڑ نظر آیا تو سب لوگ

---

[۱] رحمۃ للعالمین، جلد اوّل، صفحہ ۱۹۳

بیتاب ہو کر اس پر ٹوٹ پڑے اور بکریاں لوٹ لیں۔ آنحضرت صلعم کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ موقع پر تشریف لائے۔ اس وقت تک گوشت ہانڈیوں میں چڑھایا جا چکا تھا۔ آپ کے ہاتھ میں کمان تھی، اس سے آپ نے ہانڈیاں الٹ دیں اور گوشت خاک میں مل گیا، پھر فرمایا "لوٹ کے گوشت اور مردار گوشت میں کوئی فرق نہیں ہے"[۱]

مفتوحہ ملک سے جو مال و دولت ہاتھ آتا تھا وہ فاتح کا حق سمجھا جاتا تھا اور عیش و عشرت کے چراغ روشن کرنے اور رقص و سرود کی محفلیں گرم کرنے کے کام میں لایا جاتا تھا، اور دربار کے امراء اس سے حسب حیثیت مستفید ہوتے تھے۔ آپ نے بحکم خداوندی اس میں محتاجوں، بے بسوں اور لاوارثوں کے حقوق مقرر فرمائے۔

وَاعْلَمُوا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْءٍ	"اور جان لو کہ جو کچھ تمہیں غنیمت
فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُولِ	میں حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ خدا
وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی	کا ہے اور رسول کا اور رشتہ داروں
وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ۔	کا اور یتیموں کا اور غریبوں اور
(الانفال)	مسافروں کا"

۴

دنیا میں دلیری اور شجاعت اور جنگجوئی اور سپہ سالاری کے عظیم الشان کارناموں

---

[۱] سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد۔

کی کمی نہیں ہے۔ تاریخ کے مختلف دوروں میں کرۂ ارض کے مختلف حصوں سے ایسی لائق بردوش ہستیاں اٹھتی رہی ہیں جنھوں نے اپنی تلواروں کی نوکوں سے دنیا کے طبقے الٹ دئے ہیں، لیکن کیا کبھی انکی فتح ونصرت کی بازگشت روح انسانی کے نہاں خانوں میں بھی سنی گئی ہے؟ کیا انکی تلواریں اوہام اور خیالات فاسدہ کی بیڑیاں کاٹ کر تہذیب و معاشرت کا کوئی نیا خاکہ بھی پیش کرسکی ہیں؟ اور کیا کبھی کسی سکندر یا چنگیز یا نپولین کی قوتِ بازو کے صدقہ میں انسانیت کو اس کے قلب و روح کی سیاہی، ناپاکی اور زنگ آلودگی سے نجات مل سکی ہے؟

برخلاف اسکے انبیاء علیہم السّلام کے پیش نظر ہمیشہ ہمارے باطن کی اصلاح رہی ہے۔ انھوں نے ہماری روحانی و اخلاقی خامیوں اور بیماریوں کے علاج بہم پہونچائے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ "تن کی دنیا" دراصل "من کی دنیا" ہی کا پرتو ہے اور جب تک انسانوں کے ادراک و احساس و اخلاق کو سنوارا نہ جائے اسی خارجی دنیا کا سنورنا محال ہے۔

نبی اگر سر پر خود پہن کر اور ہاتھ میں تلوار لے کر میدان جنگ میں آتا بھی ہے تو اسکی مثال اس ماہر جراحت کی ہوتی ہے جو ہاتھ میں نشتر لے کر آپریشن کی میز کے پاس جاتا ہے۔

متعدد بار صحابہ کرام نے یہ منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ معرکۂ کارزار گرم ہے۔ تیروں کی بارش ہو رہی ہے، تلواریں چمک رہی ہیں، سر تن سے جدا ہو رہے ہیں اور رسول اللہ صلعم کا سرِ مبارک سجدۂ نیاز میں خم ہے۔ توکل کی سپر، دعاؤں کے تیر، یقین کی زرہ، صداقت کی شمشیر۔ یہ ہیں ایک نبی کے اسلحہ خانے

کے اصلی آلات جبر۔

یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ تمام غزوات میں ایک بار بھی آنحضرت صلعم کا دستِ مُبارک خون آلود نہیں ہوا۔

۵

اب آئیے ایک نظر غزوات نبویؐ پر بھی ڈال لیجیے۔ آپ کے کل غزوات اور سرایا کی تعداد، مشہور سیرت نگار نبوی قاضی سلیمان منصور پوری کی تحقیق کی رو سے بیاسی (۸۲) ہے اور ان سب میں طرفین کے مجموعی نقصانات کا جو نقشہ انھوں نے پیش کیا ہے وہ حسب ذیل ہے۔[۱]

نام فریق	اسیر	زخمی	مقتول	کل	کیفیت
مسلمان	۱	۱۲۷	۲۵۹	۳۸۷	ہر دو جانب کے زخمیوں کی تعداد قطعی نہیں ہے۔
مخالف	۶۵۶۴	—	۷۵۹	۷۳۲۳	اسیروں اور مقتولوں کی تعداد انشاء اللہ صحیح ہے۔
میزان	۶۵۶۵	۱۲۷	۱۰۱۸	۷۷۱۰	

جن جنگوں کے مجموعی نقصانات کے اعداد شمار یہ ہوں انکی بابت یہ کہنا کہ عرب جیسے جنگجو اور رزم پیشہ ملک میں صدیوں پُرانے مذہبی اعتقادات پر اسلام کے غالب آنے کا اصلی راز ان ہی میں پوشیدہ ہے کہاں تک قرین عقل و صداقت ہے؟

---

[۱] رحمۃ للعالمین ج ۲ ص ۲۶۷-۲۲۰

پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ یہ جنگیں کن حالات میں پیش آئیں اور کیا اسباب تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلوار اٹھانے پر مجبور کیا؟

صورت یہ تھی کہ مسلمانوں کے مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد قریش مکہ اس حقیقت کو شدت سے محسوس کرتے رہے کہ اسلام کا وقتی طور پر ان کی سرزمین سے ہٹ جانا کسی طرح ان کے مذہبی عقائد اور رسوم کی حفاظت و بقا کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر اسلام کو مدینہ میں جڑ پکڑنے کا موقع مل گیا تو رفتہ رفتہ اسکی شاخیں مکہ پر ضرور اپنا سایہ ڈالیں گی اور پھر عرب میں جو سیاسی تفوق اور روحانی برتری انکو حاصل ہے اسکا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو ان کے نئے مسکن میں بھی سکون سے نہ بیٹھنے دیا جائے۔ وہ ایک طرف تو خود مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگے اور دوسری طرف تمام قبائل عرب کو بھڑکایا کہ اگر یہ نیا گروہ کامیاب ہو گیا تو تم فنا ہو جاؤ گے۔

یہ واقعہ تو نظر سے گزر چکا ہو گا کہ جب بیعت عقبہ میں انصار آنحضرت صلعم کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے تو ایک انصاری نے کہا تھا کہ "بھائیو! جانتے ہو کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب و عجم سے اعلانِ جنگ ہے۔" گویا یہ حقیقت کسی سے چھپی نہ تھی کہ اسلامی مرکز کا مکہ سے مدینہ منتقل ہونا مشرکین عرب کے نزدیک ایک چیلنج تھا۔ چنانچہ ہجرت کے فوراً بعد ہی قریش نے مدینہ کے رئیس عبداللہ بن ابی کو کہلا بھیجا تھا کہ "محمدؐ کو مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم خود وہاں آکر تمھارا اور محمدؐ دونوں کا فیصلہ کر دینگے۔"

اس صورت میں یہ لازمی تھا کہ مدینہ کی حفاظت کی تدبیریں اختیار

کی جائیں۔ حفاظت کا حتی الامکان پورا انتظام نہ کرنا صرف اسلام کے وجود ہی کو سخت خطرہ میں نہ ڈال دیتا بلکہ اہلِ مدینہ کے ساتھ بدعہدی کا بھی مرادف ہوتا اور پھر جو قلم آج نبی صلعم کے تلوار اٹھانے کے خلاف اوراق اور جلد یں سیاہ کر رہے ہیں آپکے تلوار نہ اٹھانے پر نکتہ چینی کرتے ہوتے۔

ٹامس کارلائل (THOMAS CARLYLE) نے ان واقعات پر یوں تبصرہ کیا ہے:۔ "اب تک محمدؐ نے اپنے دین کی اشاعت صرف تبلیغ اور تلقین ہی کے ذریعہ کی تھی۔ لیکن اب بے رحمی کے ساتھ اپنے آبائی وطن سے نکال دیئے جانے کے بعد۔ جب کہ غیر منصف انسان نے صرف ان کے آسمانی پیغام اور انکے دل کی پکار کو سننے ہی سے انکار نہیں کر دیا تھا بلکہ اپنی بات پر قائم رہنے کی پاداش میں انکے خون کا بھی پیاسا ہو گیا تھا۔۔۔ صحرا کے اس تہذیب ناآشنا فرزند نے ایک مرد اور ایک عرب کی طرح اپنے تحفظ کا ارادہ کیا۔"[1]

---

[1] آن ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ صفحہ ۶۱ (ON HEROES AND HERO WORSHIP)

ساتواں مقالہ

کامیاب ترین پیغمبرؐ

هُوَ الَّذِیٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ

(خدا نے تیری تائید کی اپنی نصرت سے۔ القرآن۔ انفال)

پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) "تمام پیغمبروں اور دینی رہنماؤں میں سب سے زیادہ کامیاب رہے"۔[1]

نبوت کا فریضہ دنیا کا سب سے مشکل فریضہ ہے۔ خدا کی شان کہ اس نے اس مشکل ترین کام میں سب سے زیادہ کامیابی اپنے اس بندے کو عطا کی جس کے پاس بظاہر کامیابی کے وسائل سب سے کم تھے۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا، باب "قرآن"۔ (ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA CHAP, KORAN)

حضرت موسیٰ عیش و عشرت کے گہوارہ میں پلے تھے۔ حضرت عیسیٰ کی قوم اپنے عہد کی سب سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ قوم تھی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات برعکس تھے۔ پیدا ہوئے تو یتیم، لڑکپن بکریاں چراتے گذرا۔ جوان ہونے پر فکر معاش ایسی دامنگیر ہوئی کہ ایک دن بھی اطمینان سے بیٹھنے کو نہ ملا۔ ان حالات میں نوشت و خواند کا کیا اہتمام ہوتا؟ لکھنے پڑھنے سے قطعاً ناواقف رہے۔ قوم ایسی ملی تھی جو اپنی گمرہی کو ہی عین آگہی سمجھتی تھی۔ پھر بھی آپنے اللہ کا پیغام اسکے بندوں تک پہونچانے میں وہ شاندار کامیابی حاصل کی جو آج تک اپنی آپ مثال ہے۔

حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو فرمانروایان مصر کے ظلم سے نجات دلائی۔ آزادی اور عزت کی زندگی میسر کرائی۔ اسکے بدلہ میں بنی اسرائیل نے ان کے ساتھ احسان فراموشی کی انتہا کردی۔ اور خطرہ کے موقع پر یہ کہہ کر صاف الگ ہوگئے کہ "تم اور تمھارا خدا جاؤ اور لڑو، ہم یہیں رہیں گے"۔ حضرت عیسیٰ کے قریبی اعزا تک نے انکی بات نہ سنی۔ خود ان کے بھائیوں نے انکی نبوت کی تردید کی[1] اور ان کے خون کے پیاسے ہوگئے[2]۔

حضرت عیسیٰ افسوس کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ "یہ بات نہیں ہو کہ نبی کا احترام نہیں ہوتا۔ البتہ اسکے گھر اور اسکے ملک میں اس کی عزت نہیں ہوتی"[3]۔ ان کی تشریف بری کے وقت انکا کل سرمایۂ حیات گنتی کے چند پیرو تھے جن میں زیادہ تر دھوبی اور اسی قسم کے پسماندہ اور ناتعلیم یافتہ لوگ تھے۔

---

[1] انجیل [2] مارک [3] متی

اور ایک حضرت عیسیٰ پر کیا موقوف حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی نبی کو اسکی زندگی میں اپنی کوششیں پوری طرح بار آور ہوتے دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اگر کسی نبی کے گلستانِ آرزو میں بہار آئی بھی تو اس کی آنکھیں بند ہو چکنے کے بعد یہ مژدہ جانفزا صرف حضور ہی کے مقدر میں تھا کہ:۔

جاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ — حق آ گیا اور باطل چلا گیا۔ باطل تو

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا — جانے ہی والا تھا۔

اور یہ چیز صرف حضور ہی کو نصیب ہوئی کہ آپ نے لوگوں کے دینِ حق میں فوج در فوج داخل ہونے کا منظر اپنی آنکھوں دیکھ لیا۔

اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ — جب آجائے خدا کی نصرت اور تم

وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ — دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج خدا کے

فِیْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ — دین میں داخل ہو رہے ہیں۔

عرب کی سرزمین پر یہ انقلاب کس حیرت انگیز تیزی سے آیا اور کسطرح دیکھتے ہی دیکھتے سارے جزیرہ نما پر حق کا نور سیلاب کی طرح پھیل گیا؟ اسکا حال ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے سنئیے:۔

"سنہ ۱ھ میں شہر مدینہ کے چند محلے اسلامی مملکت کہلانے لگے تو اس میں دس سال تک اوسطاً روزانہ ۲۷۴ مربع میل کی بے نظیر سرعت سے اضافہ ہوتا رہا اور جب سنہ ۱۱ھ میں نبی اکرم نے اس دنیاوی زندگی سے علیحدگی اختیار فرمائی تو پورے دس لاکھ مربع میل یعنی تقریباً ہندوستان کے برابر کا علاقہ مسلمانوں کی آقائی میں آ چکا تھا، اور ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو

پندرہ سال بھی نہیں گذرے تھے کہ احکام اسلام پر عمل کرنے کے باعث مسلمان ایشیا، یورپ اور افریقہ کے تین براعظموں پر چھا گئے اور یہ حضرت عثمان کا زمانہ تھا کہ جب ایک طرف مسلمانوں نے اسپین میں قدم جمالئے اور دوسری طرف قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔[۱]

عرب جیسی جاہل، بے مایہ اور صحرا نورد قوم یکایک دنیا کی توجہ کا مرکز بن گئی ـــــ "وہ غریب مویشی چرانے والے لوگ جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کی حالت میں ریگستانوں میں مارے مارے پھرتے تھے ان میں ایک ہیرو پیغمبر بھیجا گیا جو اپنے ساتھ ایک ایسا پیغام لایا جس پر وہ یقین کر سکتے تھے، اور دیکھو! جنھیں کوئی توجہ نہ دیتا تھا وہ عالمگیر توجہ کے حقدار ہو گئے۔ جو حقیر اور کمتر تھے وہ دنیا کی نظروں میں معزز اور ممتاز بن گئے اور ایک ہی صدی کے اندر عرب اس طرف غرناطہ پر تھا تو اس طرف دہلی (؟) میں اور ایک طویل عرصہ تک عرب تابان دنیا کے طویل حصہ پر چمکتا رہا۔"[۲]

اس بے مثال اور محیر العقول عروج کا سرچشمہ آنحضرت صلعم کی دلکش و دلنواز شخصیت تھی آپ کی حیرت انگیز شخصی کشش اور آپ کے اصولوں کی ہمہ گیر صداقت نے ہر گوشہ اور ہر طبقہ کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا اور چاروں طرف عقیدت کے بے مثال جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ یہ آپ کے اعلیٰ شخصی صفات، عزم کی صلابت اور پُر خلوص شفقت کا اثر تھا کہ آپ کی قوم آپ کے ابرو کی جنبش پر نثار ہونے کو

---

[۱] "آنحضرت صلعم اور رجوانی" [۲] "ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ" ص

ہر وقت تیار رہی ہے۔

آپ کی آواز پر آپ کی اُمّت کا ضمیر وجد کرتا تھا۔ آپ کے ارشادات کسی مطلق العنان صاحب کشور و نگیں کے احکام نہ تھے۔ جاہ و جلال اور طاقت و ثروت کے مظاہر عوام کے قلوب میں اکثر انقیاد و مرعوبیت پیدا کر دیتے ہیں لیکن آپ کو نمود اور نمائش سے فطری نفرت تھی۔ آپ نے کبھی اپنے پاس شان و شوکت کے لوازم جمع نہ ہونے دیئے۔ تواضع و انکساری اور عاجزی و خاکساری آپ کی پسندیدہ اخلاقی صفات تھیں۔ آپ اپنی بندگی اور بے مائیگی کا ہر نفس اقرار و اعلان فرماتے رہتے تھے۔ انبیاء کی عبدیت آپ کے لائے ہوئے دین کا بنیادی عقیدہ تھی۔ آپ بے تکلف فرمایا کرتے تھے کہ "میں تو ایک آدمی ہوں۔ جب دین کا کوئی حکم دوں تو اسے قبول کرو اور جب امور دنیا میں کوئی مشورہ دوں تو میں محض ایک آدمی ہوں۔ میں خدا پر جھوٹ نہ کہونگا"[1] اور یہ بھی کہ میری شان میں مبالغہ نہ کرو جیسا کہ یہود اور نصاریٰ نے اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا ہے"[2] اس سب کے باوجود آپ کی قوم کی وفاشعاری اور جاں نثاری کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے شاہی درباروں کے نمائندے دیکھتے تھے اور حیرت کرتے اُٹھتے تھے۔

آج آپ کے عہد کو تیرہ سو برس گذر چکے ہیں۔ آپ کے غلاموں کی تعداد اب تیس کروڑ سے اوپر ہے وہ دنیا کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ عام روحانی اور اخلاقی انحطاط کا ان پر بھی اثر پڑا ہے اور وہ دین قیم کی صاف سیدھی اور روشن راہ سے بھٹک گئے ہیں۔ لیکن اب بھی وہ اپنے آقا اور رسول

---

[1] مسلم [2] بخاری۔ کتاب الانبیاء

کے نام و ناموس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کو حقیر سمجھتے ہیں اور جب آپ کا نام سنتے ہیں تو ادب سے آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں اور درود اور سلام بھیجنے لگتے ہیں۔

جیسا کہ اب سے تیس برس پہلے ایک برطانوی اخبار میں شایع ہوا تھا۔ "اگر کسی مردِ عظیم کے بلند پایہ پیغام کے جانچنے کا پیمانہ تقدیس و تعظیم کے وہ جذبات ہیں جو اسکے الفاظ ان لوگوں میں پیدا کرتے ہیں جو ان کی آسمانی نوعیت پر یقین رکھتے ہیں تو محمد کا شمار عظیم ترین ہستیوں میں یقیناً ہونا چاہیئے"۔[1]

۲

نبی اکرم کی ذات ہمیں ایک معیاری شخصیت کی حامل نظر آتی ہے۔ جو دس برس کے مختصر عرصہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے تمدن، ایک نئے فلسفۂ حیات اور ایک نئی شریعت کی بنیاد رکھ کر ایک نئی قوم پیدا کرتی ہے اور سلف پرستی، توہم ضد، اور مخالفت کے باوجود گویا کہ اس (قوم)، کی خواہش اور ارادہ کے بالکل خلاف اسکو روحانی و مادّی ترقی اور سرفرازی کی شاہ راہ پر گامزن کر دیتی ہے۔

دس برس کے اندر تمام ملکِ عرب میں امن و امان قائم ہو گیا تھا، قبائل کی خانہ جنگیاں ختم ہو گئی تھیں، جرائم کا بازار سرد پڑ گیا تھا، رہزن رام ہو گئے تھے۔ خدا کا یقین عوام کی زندگی کا نشانِ راہ بن گیا تھا۔ خلوت و جلوت کے تمام معاملات میں وہ اسکی حاضر و ناظر ذات کو محسوس کرتے تھے۔ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ گیا تھا جس میں امن قائم رکھنے کے لئے پولیس کی حاجت نہ رہی تھی۔

---

[1] "ڈیلی ایکسپریس" لندن، مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۲۵ء (DAILY EXPRESS, LONDON NOV., 10, 1925.)

جرم مفقود ہو گئے تھے اور اگر کسی سے کوئی جرم سرزد ہو بھی جاتا تھا تو وہ خود بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر اقرار کر لیتا تھا۔

آنحضرت صلعم نے ایک بار بشارت دی تھی کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا کہ صنعاء (یمن) سے حجاز تک ایک محل نشین خاتون تنہا سفر کرے گی اور اسے علاوہ خدا کے کسی کا خوف نہ ہوگا۔ لوگ اس پر تعجب کرتے تھے کہ جس ملک میں بڑے بڑے قافلے سلامتی کے ساتھ نہیں گذر پاتے تھے وہاں پردہ نشین عورت، ذات مسافروں کو اتنا اطمینان بھلا کیسے نصیب ہوگا لیکن چند ہی سال بعد عدی بن حاتم نے شہادت دی کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آنحضرت صلعم کی پیشین گوئی کے مطابق ایک عورت صنعاء سے حجاز تک تن تنہا سفر کرتی تھی اور راستہ میں اسکو کسی طرح کا خطرہ نہیں ہوتا تھا۔[1]

خارجی خطروں کا انسداد بھی آپ ہی کے سامنے ہو گیا تھا۔ عرب کے سرحدی علاقے رومیوں اور ایرانیوں کے پنجۂ ظلم سے آزاد ہو گئے تھے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد مسلمانوں نے انکی طاقت پامال کر کے رکھدی۔

فتنہ و فساد کی جگہ صلح و امن کے قائم ہوتے ہی لوگوں کی روحانی اور اخلاقی صلاحیتوں نے ابھرنا شروع کیا اور ان میں زندگی کی نرم اور حسین قدروں کا شعور پیدا ہوا۔ عورتوں کو بے حرمت کرنے والے حقوقِ نسواں کے سب سے بڑے حامی بن گئے۔ جہاں بے قید کثرتِ ازدواج نے ایک وبا کی شکل اختیار کر لی تھی،

---

[1] صحیح بخاری۔

وہاں نکاحوں کی تعداد متعین ہوگئی۔ جہاں گھر گھر شراب خانے کھلے رہتے تھے وہاں شراب ایسی حرام ہوئی کہ گلیوں میں مے نوشی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ڈھیر لگ گئے۔ رنگ و نسل کی تفریق ایسی مٹی کہ آقا و غلام میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ جھوٹ، غیبت، بہتان، رشوت، سود، قمار، ظلم، اولاد کشی اور حق تلفی وغیرہ کے بجائے ان کے برعکس اوصاف نے رواج پایا۔ جہاں ہر خاندان ایک علیحدہ دیوتا کے آگے سر جھکاتا تھا وہاں معبودِ حقیقی کے علاوہ باقی تمام خدا اور خداوند جھوٹے ہو گئے اور جو لوگ اسی دنیائے آب و گِل کی لذتوں کو زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے ان میں آنے والی زندگی کا ایسا احساس پیدا ہو گیا کہ اس میں کام نہ آنے والے تمام اعمال و عادات خود بخود موسمِ خزاں کے پتّوں کی طرح جھڑ گئے۔

سید امیر علی کہتے ہیں کہ "ان چند برسوں نے واقعی کیا انقلاب دیکھا تھا۔ یقیناً جنّت کا کوئی فرشتہ ملک سے ہو کر گذر گیا تھا جس نے ان لوگوں کے قلوب میں محبّت اور لطافت کا جادو پھونک دیا تھا جو اس وقت تک نیم درندگی کی انتہائی قابلِ نفرت پستیوں میں دھنسے ہوئے تھے۔ لاقانونیت کا وہ جنگل جہاں تمام خدائی اور انسانی قوانین بلاجھجک جھٹلائے اور توڑے جاتے تھے، گلزار بن گیا تھا۔"[1]

سید امیر علی کے اس بیان کی بابت ممکن ہے کہ بعض غیر مسلم حلقوں میں سوچا جائے کہ انکا قلم جوشِ عقیدت کی رَو میں تاریخی دیانتداری کی حد سے گذر گیا

---

[1] "اسپرٹ آف اسلام" 'SPIRIT OF ISLAM.'

تھا، مگر سر ولیم میور (SIR WILLIAM MUIR) کی "لائف آف محمد" (LIFE OF MOHAMMAD) کے متعلق تو ایسا نہیں خیال کیا جاسکتا ہو۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:۔

"محمد کے اصول مختصر اور سیدھے سادھے تھے۔ ان کی تعلیم نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ اس زمانہ سے لے کر جب ابتدائی مسیحیت نے دنیا کو خواب گراں سے چونکایا تھا اور کفر کے خلاف جان توڑ جدوجہد کا بیڑا اٹھایا تھا، لوگوں نے اس طرح کی روحانی بیداری کا منظر نہیں دیکھا تھا اور نہ اس طرح کی ایمانی قوت دیکھی تھی جو ضمیر کی خاطر تمام قربانیاں اور مال و اسباب کا نقصان ہنسی خوشی برداشت کراتی تھی۔"

"...... ہجرت سے تیرہ سال قبل مکہ اس ذلیل حالت میں بے جان پڑا ہوا تھا۔ ان تیرہ برسوں نے اب کیسی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ سیکڑوں آدمیوں کے گروہ نے بت پرستی ترک کر دی تھی۔ ایک خدا کی عبادت اختیار کر لی تھی اور خود کو مکمل طور پر اس ہدایت کے سپرد کر دیا تھا جس کی بابت انکو یقین تھا کہ خدا کی طرف سے تھی۔ وہ اسی قادر مطلق سے رحم و عفو کے طالب ہوتے تھے اور صدقہ و خیرات عصمت و عفت اور عدل و انصاف جیسے اچھے کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ اب خدا کی بے پناہ قوت کو ہر وقت محسوس کرتے ہوئے زندگی گذارتے تھے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملوں میں بھی اسی کی کارسازی پر نظر رکھتے تھے۔ قدرت کے تمام عطیوں میں، زندگی کے تمام مرحلوں

اور زمانہ کے انقلابوں میں خواہ وہ نجی ہوں یا اجتماعی، انکو اسی کا ہاتھ نظر آتا تھا مزید برآں، اسی نئی زندگی کو عنایت ربانی کی ایک خاص علامت سمجھا جاتا تھا اور انکار کرنے والوں کی بدعقیدگی کو بڑھتے ہوئے عذاب کا نتیجہ۔ ان کے نزدیک محمدؐ زندگی کے معلم تھے، بہ فضلِ ایزدی انکی نئی اُمنگوں کے مخزن تھے اور وہ انکی مکمل اطاعت کرتے تھے .... حضرت موسیٰ کی صدائے حق مدینہ والوں کے کانوں میں عرصہ ہوا پڑ چکی تھی، لیکن رسول عربی کے روح کو بیدار کرنے والے نغمہ کو سننے کے بعد ہی وہ اپنی گہری نیند سے چونکے اور ایک نئی اور پرخلوص زندگی میں یکایک منہمک ہو گئے۔"

آنحضرت صلعم کا پیغام آپکی قوم کے مزاج کی طرح صاف اور سادہ تھا، لیکن وہ یورپین مورخ سرتاپا غلطی پر ہیں جو آپ کی کامیابی کا سبب آپکے احکام کا مکروہات اور ممنوعات کے بارہ میں ڈھیلا ڈھالا ہونا بتاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام خون اور گوشت کے مطالبات کی بیدردانہ پامالی نہیں کرتا ہے اور نہ کوئی مذہب جو فطرت کے مطابق ہونے کا دعویٰ کرے ایسا کر ہی سکتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہاں نفس کا اتنا مستحکم محاصرہ بھی ہے کہ کسی معاملہ میں من مانی کرنے کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔ شرع محمدی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایسی واضح حدبندیاں ہیں جو مومن کی زندگی کو نظم و نسق کی تصویر بنا دیتی ہیں۔ جو دین دن میں پانچ وقت کی نماز اور سال میں تیس دن کے مسلسل روزے فرض کرتا ہو، جو لباس اور جسم کی طہارت پر سخت پابندیاں لگاتا ہو، جو دنیا کو مومن کا جیل خانہ بتاتا ہو، جو زندگی کی ہر سانس کو ایک ہی خدا کی اطاعت میں

گذارنے کا حکم دیتا ہو اسکے متعلق یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ اسکی جاذبیت کا راز نفس پروری کے مواقع مہیا کرنے میں ہے۔

یہاں کارلائل (CARLYLE) کا یہ قول نقل کرنا بے محل نہ ہوگا کہ "(محمد کا) مذہب آسان نہیں ہے۔ اس میں سخت قسم کے روزے ہیں۔ غسل وضو کی قیدیں ہیں۔ طرح طرح کے مشکل مسائل ہیں، دن کی پانچ وقت کی نماز ہے اور شراب کی حرمت ہے۔ اس کی کامیابی کا سبب اس کا آسان ہونا نہیں ہو۔"

پیغمبر صلعم کی شخصیت کی جامعیت، آپکے ارادہ کی پختگی، آپ کی دعوت کی تاثیر، آپکے پیغام کی صداقت، آپ کی نیت کے اخلاص، آپکے اخلاق کی پاکیزگی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت وعنایت سے افق عرب سے رفتہ رفتہ تمام تاریکیاں دفع ہوگئیں اور ایک نئی صبح کا پرچم لہرانے لگا، ایک متحدہ قومیت، ایک متحدہ حکومت ایک متحدہ تمدن، ایک منضبط قانون، ایک مکمل شریعت اور ایک ابدی مذہب کا درخشندہ دور وجود میں آگیا۔

۳

یہ مبارک دور عرب تک محدود نہیں رہا۔ جو ساری دنیا کو خوشخبری سنانے ڈرانے، ہشار کرنے اور پاک وصاف بنانے آیا تھا، جس کی حیثیت انسانیت کے آخری معلم اور "نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ کی تھی" اس کا پیغام کسی جغرافیائی یا نسلی خطہ کے لئے مخصوص نہیں تھا۔ اسلام جلد ہی دنیا کے بہت بڑے حصہ پر چھا گیا۔

اسلام کی روحانی اور علمی برکتوں کا رفتہ رفتہ یورپ پر اثر پڑنا شروع ہوا جو اس وقت تک نیم شائستگی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسلامی اسپین کے علمی اور تہذیبی

مراکز ہی درحقیقت روشنی کے وہ منارے تھے جن کی بدولت یورپ کو قرونِ وسطیٰ کے اندھیرے سے نکلنا نصیب ہوا۔ پھر صلیبی جنگوں نے مختلف یوروپین قوموں کو اسلامی تمدن سے براہ راست روشناس ہونے کا بیش قیمت موقع بہم پہونچایا۔ اس طرح یورپ کی نشاۃ ثانیہ عمل میں آئی اور وہ تاریخ کے جدید دور کا آغاز ہوا۔

مسلمانوں نے یورپ اور کل دنیا کو کیا کچھ دیا اس کو بیان کرنے کے لئے دفتر چاہئیں۔ بریفالٹ (BRIFFAULT) کا فیصلہ ہے کہ "اگرچہ یوروپین نشوونما کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر اسلامی تمدن کا فیصلہ کن اثر نہ پڑا ہو، لیکن یہ اثر سب سے زیادہ نمایاں اس صلاحیت کو بیدار کرنے میں پایا جاتا ہے جو جدید دنیا کی سب سے نمایاں اور امتیازی شان ہے یعنی طبیعاتی سائنس اور سائنٹفک اسپرٹ"۔[۱]

دوسرے الفاظ میں قدیم سے جدید کی طرف تاریخ کا دھارا اسلام ہی نے موڑا۔

موجودہ زمانہ کے جیّد مورخ پروفیسر ٹوائن بی (PROF. TOYNBEE) نے اسلام کے تمدنی اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نسلی تفریق اور اونچ نیچ کا انسداد اور شراب کی حرمت یہ دو ایسے کارنامے ہیں کہ انھیں عالمگیر تہذیب میں اسلام کے مستقل اضافے کہا جاسکتا ہے۔[۲]

ہمارے اس نام نہاد جمہوریت اور برابری کے دور میں بھی اخوت اور مساوات

---

[۱] "میکنگ آف ہیومینٹی"۔ ('MAKING OF HUMANITY')

[۲] "سویلائیزیشن آن ٹرائل" "CIVILISATION ON TRIAL"

کی بات درحقیقت فریب آرزو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ہے۔ نعرہ بازی اور مصلحت آمیز جھوٹ سے الگ ہو کر اگر دیکھا جائے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یا تو برادری کے اعلانچی ان اعلیٰ اصولوں کے صحیح مفہوم ہی سے بے خبر ہیں یا وہ جان بوجھ کر دنیا کو، یا کم از کم پسماندہ دنیا کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ امریکہ میں حبشی النسل باشندے دوسرے درجہ کے شہری تصور کئے جاتے ہیں۔ براعظم افریقہ میں کالے گورے کی جنگ جاری ہے۔ ہندوستان کی کئی کروڑ آبادی اچھوت بنی ہوئی ہے۔ معاشرتی اور اقتصادی حالات پر اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز ایک علٰحدہ مصیبت ہے۔

دعوت اسلام کی بنیاد توحید پر ہے اور اس کا لازمی نتیجہ نوع انسانی کی وحدت کا اعتراف ہے۔ جب تمام انسان ایک ہی ذات پاک کے خلق کئے ہوئے ہیں تو پھر رنگ و نسل کے امتیازات اس سے زیادہ اور کیا حیثیت رکھ سکتے ہیں کہ یہ صرف تعارف کا ذریعہ ہیں۔ باقی عزت و شرافت میں ان کو کوئی دخل نہیں، چنانچہ فرمایا گیا:۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ	لوگو! میں نے تم کو ایک مرد اور عورت
مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی، وَجَعَلْنٰکُمْ	سے پیدا کیا اور تمھارے قبیلے اور خاندان
شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا	بنائے کہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچان
اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ	لئے جاؤ۔ لیکن خدا کے نزدیک شریف وہ
اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ	ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔ خدا دانا اور
(القرآن)	واقف کار ہے۔

شادی بیاہ کے موقعوں پر حسب نسب کی تلاش ایک عام بات ہے۔ نبی اکرمؐ اس

انسانی کمزوری کے خطرناک امکانات سے خوب واقف تھے۔ آپ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب کی شادی مکہ کے زرخرید غلام زید بن حارث سے کر کے مساوات کا عملی نمونہ پیش کیا۔ اسی طرح آپ نے حضرت ابو حذیفہ کی بھتیجی اور قریش کی ممتاز خاتون فاطمہ بن ولید کا عقد ابو حذیفہ کے غلام اسامہ سے کرایا تاکہ آقا و غلام کے درمیان شرعی برابری کا سبق اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

مدینہ کے انصار اپنی بیٹی دینے میں بہت سخت تھے۔ یہاں تک کہ جب قریش کے ممتاز رئیس ہاشم بن عبد مناف نے مدینہ کی ایک خاتون سے نکاح کی درخواست کی تھی تو اسکے قبیلہ نے اس شرط پر اجازت دی تھی کہ وہ کبھی رخصت ہو کر مکہ نہ جائے گی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اسی قبیلہ کی کایا ایسی پلٹی کہ ایک روز حضرت بلال نے مسجد میں اپنے بھائی کے لئے درخواست دی کہ میں غلام ہوں، حبشی ہوں، بے مایہ ہوں، بہ ایں ہمہ بھائی کی شادی کا خواہاں ہوں تو اسکے کئی معزز خاندانوں نے ان سے رشتہ قائم کرنے کی خود پیش کش کی۔

غرضکہ رسول اللہ صلعم نے قول اور نصیحت کے ساتھ اپنے عمل سے بھی عدمِ مساوات کے جملہ احتمالات کا خاتمہ کر کے اپنی ہی زندگی میں ایک ایسی سوسائٹی پیدا کر دی تھی جس میں اخوت اور برابری کی حیثیت صرف دلخوشکن نظریہ کی نہیں بلکہ عملی حقیقت کی ہو گئی تھی۔ آپ سے قبل نوع انسانی کو مساوات کا پیغام تو اکثر دینی رہنما سنا چکے تھے، مگر ان کے ذہنوں میں انسانی وحدت کا کوئی واضح تصور نہیں تھا۔ یہ کمی اسلام نے پوری کی۔ "تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹّی سے بنے ہیں۔" یہ واضح اعلان پیغمبر اسلام ہی کی زبان سے ہوا۔

فلنٹ (FLINT) کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ "کسی مسیحی مصنف یا اس سے بھی کم رومی سلطنت کے کسی شخص کو انسانی وحدت کے عام اور مبہم تصوّر سے زیادہ کا حقدار نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے۔"

یہ اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ حضرت عمر فاروق کا سفر شام والا واقعہ آج تک مثال کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ خلیفۂ ثانی عازم شام ہوئے تو ایک اونٹ تھا اور دو سفر کرنے والے۔ ایک آپ خود، ایک آپ کا غلام، چونکہ اونٹ کی پچھلی نشست پر زادِ راہ اور اونٹ کے لئے کھجور کی گٹھلیاں لدی ہوئی تھیں اس لئے یہ طے پایا کہ نوبت بہ نوبت ایک سوار ہو اور دوسرا پیدل چلے۔ آخری منزل پر غلام کے سوار ہونے کی باری آئی تو آقا اتر پڑے۔ اُدھر دارالسلطنت شام میں اسلامی افواج امیرالمومنین کے استقبال کے لئے صف بستہ تھیں، اور مختلف قوموں کے بہت سے لوگ اس جشن پر حشم کا تماشہ کرنے کو جمع ہو گئے تھے کہ گردِ راہ سے ایک اونٹ نمودار ہوا۔ مسلمان امراء پیشوائی کے لئے بڑھے، غیر مسلم تماشائیوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ انھوں نے مسلمانوں سے پوچھا "کیا آپ کے خلیفہ یہی ہیں جو اونٹ پر سوار ہیں؟" اس پر ایک مجاہد نے جواب دیا "نہیں، ہمارے خلیفہ وہ ہیں جو پیدل چل رہے ہیں۔ اونٹ پر ان کا غلام سوار ہے۔"

عہدِ فاروقی ہی کا ذکر ہے کہ سلطنت غسّان کا عیسائی شہزادہ جبلہ بن ایہم جس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور مسلمانوں میں اسکی بڑی عزت ہوتی تھی ایک بار خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ ایک بدّو کا پاؤں اسکے چوغہ کے دامن پر پڑ گیا شاہی مزاج اسکا متحمل نہ ہو سکا اور شہزادہ نے پلٹ کر بدّو کے منہ پر طمانچہ مار دیا۔ بدّو نے

امیرالمومنین کی خدمت میں استغاثہ پیش کر دیا۔ انھوں نے شہزادہ کو طلب فرمایا، شہزادہ نے اپنے فعل کا اعتراف کیا مگر اس نے کہا کہ "میں ایک سلطنت کا حکمراں ہوں۔ اگر میں نے اس دہقانی کو مار دیا تو کیا ہوا؟" ارشاد ہوا "اسلام میں شاہ و گدا میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ تم اسے راضی کر لو ورنہ بدلہ دینا پڑے گا۔" اس نے ایک دن کی مہلت مانگی اور راتوں رات مکّہ سے فرار ہو کر مرتد ہو گیا۔ حضرت فاروق کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے فخر کے ساتھ سجدۂ شکر ادا کیا کہ دنیوی مصلحتیں انھیں شرعی احکام پر عمل کرنے سے نہیں روک سکتی تھیں۔

ایک دفعہ حضرت فاروق اور حضرت علی مرتضیٰ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک یہودی نے آکر حضرت فاروق کی خدمت میں عرض کیا کہ "امیرالمومنین میں علی کے خلاف دعویٰ لے کر آیا ہوں۔" حضرت فاروق نے حضرت علی سے فرمایا "ابوالحسن سامنے کھڑے ہو کر جواب دو۔" حضرت علی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے لیکن حضرت فاروق نے محسوس کیا کہ انکے چہرہ پر کچھ ناگواری کی جھلک آگئی تھی، دعویٰ سنا گیا، مدعی جھوٹا ثابت ہوا۔ جب وہ فیصلہ سن کر چلا گیا تو حضرت عمر نے حضرت علی سے کہا "میں ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں۔" انھوں نے کہا "ضرور پوچھیے۔" حضرت عمر نے کہا "کیا آپ کو عدالت میں یہودی کے برابر کھڑا ہونا ناگوار ہوا تھا؟" انھوں نے جواب دیا "ہرگز نہیں، میری ناگواری کا سبب یہ بات ہوئی تھی کہ آپ نے اسکے سامنے مجھے میرے نام کے بجائے ابوالحسن کی کنیت سے مخاطب کیا تھا[۱] اگر اس یہودی

---

[۱] عرب میں تعظیم و عزت کے موقع پر بجائے نام کے کنیت سے خطاب کیا جاتا ہے۔

کو گمان ہو جاتا کہ آپ انصاف کے معاملہ میں مجھے اس پر ترجیح دیتے ہیں تو ہماری عدالت پر ہمیشہ کے لئے دھبہ آجاتا۔"

اسلامی تمدن کی تاریخ میں ایسے نظائر بے شمار ہیں اور اوراق کا دامن تنگ ہے، چنانچہ عہد مرتضوی کا ایک واقعہ بیان کر کے اس سلسلہ کو ختم کیا جاتا ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ اپنے دور خلافت میں ایک روز ایک غلام کے ساتھ کپڑا خریدنے بازار تشریف لے گئے۔ اور بزاز کی دوکان پر پہونچکر غلام سے فرمایا کہ میرا اور اپنے لئے کپڑے پسند کر لو، غلام نے کچھ قیمتی کپڑے پسند کئے اور کچھ سستے، قیمتی امیر المومنین کے لئے اور سستے اپنے لئے۔ درزی کے وہاں حضرت علی نے سستے کپڑے اپنے لئے قطع کرائے اور قیمتی غلام کے لئے تو غلام نے عرض کیا کہ "آپ میرے آقا اور امیر المومنین ہیں، آپ کو نفیس لباس پہننا چاہیئے۔" اس پر امیر المومنین نے نرمی سے فرمایا "میں بڈھا ہو چکا ہوں، تم جوان ہو، تم کو خوبصورت پوشاک زیادہ زیب دے گی۔"

پروفیسر ٹوائن بی (PROF. TOYNBEE) نے اسلام کا دوسرا تہذیبی شاہکار تحریم خمر بتایا ہے۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ایک اساسی ترمیم کے ذریعہ شراب کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ بس اجازت یافتہ شراب خانوں کا بند ہونا تھا کہ ملک میں لکھو کھا خفیہ شراب خانے کھل گئے، جن میں ایک تو قیمت بہت زیادہ وصول کی جاتی تھی اور دوسرے شراب نہایت گھٹیا قسم کی ملتی تھی جو صحت کے لیے بہت مضر ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ دوکانیں حرام کاری کے اڈے بن گئے تھے جہاں شراب کے ساتھ نوجوان لڑکیوں کی عصمت بھی پانی کی طرح لٹا کرتی تھی۔

قانونِ تحریم کے بعد مے فروشی کا پیشہ اتنا نفع بخش ہو گیا تھا کہ بے شمار آدمی اپنا روزگار چھوڑ کر اس میں شامل ہو گئے تھے۔ چلتے پھرتے میخانے الگ تھے۔ شراب کا کاروبار کرنے والے ـــــ ہوٹلوں، کارخانوں اور تفریح گاہوں وغیرہ میں چوری چھپے شراب پہونچاتے تھے اور نئے گاہک پیدا کرتے تھے۔

شہروں کے علاوہ گاؤں گاؤں شراب کشید کرنے کے خفیہ کارخانے کھل گئے تھے، تحریم سے پہلے امریکہ میں کل چار سو اجازت یافتہ عرق کشی کے کارخانے تھے تحریم کے بعد سات سال کے اندر ۷،۳۴۹ کارخانے اور ۹۳۸۲۱ بھٹیاں پکڑی گئیں۔ قلیل ترین اندازہ یہ ہے کہ امریکہ میں شراب کا روزگار کرنے والوں میں دس گنا اضافہ ہو گیا تھا۔[۱]

شراب بندی کے سلسلہ میں قانون کی بے دھڑک خلاف ورزی کے نتیجہ میں عمومی طور پر قانون کا احترام بھی دلوں سے اٹھ گیا تھا۔ جرائم اتنا زور پکڑ گئے تھے کہ پُر امن لوگوں کا رات میں نکلنا مشکل ہو گیا تھا۔ قتل کے جرائم میں ساڑھے تین سو فیصدی کا اضافہ ہو گیا تھا۔

بالآخر ۱۹۳۳ء میں حکومت نے ہار مان لی اور قانونِ تحریم واپس لے لیا گیا۔ چودہ برس بعد میخانے پھر جاگ اُٹھے اور امریکن قوم نے اطمینان کا سانس لیا۔

امریکا ایک جمہوری طرز کا ملک ہے جہاں رائے عامہ کے ذریعہ حکومت ہوتی ہے۔ عوام کی رائے کے خلاف کوئی قانون نافذ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہی

---

[۱] سید ابوالاعلیٰ مودودی تنقیحات، ص ۳۶

صورت قانون تحریم کی بھی تھی۔ یعنی سنہ ۱۹۲۰ء میں امریکن قوم کی اکثریت نے اپنی خوشی سے شراب کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، اور پھر سنہ ۱۹۳۳ء میں اسی اکثریت کو یہ اقرار کرنا پڑا تھا کہ شراب کی اخلاق سوزی مسلم، اس کا ام الخبائث ہونا برحق مگر ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے۔

ان چودہ برسوں میں حکومت نے شراب کے خلاف پروپیگنڈہ پر کروڑوں روپیہ صرف کیا تھا، اور لوگوں کو شراب سے باز رکھنے کی کوئی تدبیر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ لیکن بے سود۔ برخلاف اس کے اب سے چودہ سو برس پہلے جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی ممانعت فرمائی تھی تو نہ وہاں تعلیم کی روشنی تھی نہ حکومت کے تنظیمی ادارے، نہ نشر و اشاعت کے موثر آلات، اور نہ لوگ لال پری کے ایسے متوالے تھے کہ ان کی زبان میں اسکے ڈھائی سو کے قریب نام اب بھی پائے جاتے ہیں۔

شراب کے متعلق سب سے پہلے یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی تھی :-

یسئلونك عن الخمر والميسر	لوگ تم سے شراب اور جوے کی بابت
قل فيهما اثم كبير ومنافع	پوچھتے ہیں۔ کہدو کہ ان دونوں میں بڑی
للناس واثمهما اكبر من نفعهما	برائی ہے۔ اور کچھ فائدے بھی ہیں لیکن ان
(بقرہ)	کی برائی فائدے سے زیادہ ہے۔

یہ کوئی حکم نہ تھا۔ لوگوں سے یہ نہیں کہا گیا تھا کہ شراب ترک کر دو۔ صرف یہ بتایا گیا تھا کہ اس میں جوے کی طرح نفع کم اور نقصان زیادہ ہے۔ پھر بھی اس ارشادِ ربانی کے بعد مسلمانوں کے ایک طبقہ نے شراب سے توبہ کر لی۔

بعض لوگ نشہ کی حالت میں نماز میں شریک ہو جاتے تھے اور طرح طرح کی غلطیاں کر بیٹھتے تھے۔ ان کی بابت شرعی حکم کی ضرورت ہوئی تو یہ آیت نازل ہوئی:۔

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ	نشہ کی حالت میں نماز کے قریب جاؤ
سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔	(تم کو نماز ایسی حالت میں ادا کرنا چاہیئے)
(نساء)	کہ تم جان سکو کہ کیا کہہ رہے ہو۔

اسکے بعد اگر شراب کے رسیئے نماز سے دور دور رہنے لگتے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی لیکن ایسا نہ ہوا۔ لوگوں نے بادہ نوشی کے اوقات مقرر کر لئے کہ نماز میں خلل نہ پڑے۔

دن میں نہ سہی رات ہی میں سہی قوم کا بہت بڑا حصّہ اب بھی شراب پیتا رہا۔ صرف نماز ہی کے اوقات میں تو ہوش و حواس کی درستی ضروری تھی، باقی اوقات میں شغل مینا پر کوئی پابندی نہ تھی۔ لوگ رات میں آزادی سے پیتے تھے اور فتنہ و فساد برپا کرتے تھے۔ لیکن مندرجہ بالا احکام نے تحریم خمر کے آخری اعلان کے لئے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ چنانچہ کچھ مدت بعد یہ قطعی حکم نازل ہوا کہ:۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا	اے ایمان والو بیشک شراب
الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ	جوا، بت اور پانسے ناپاک اور
وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ	شیطان کے کام ہیں، تو ان سے
الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ	بچو تاکہ فلاح پاؤ۔
تُفْلِحُوْنَ۔ (مائدہ)	

جس وقت یہ آیت اتری حضرت ابوعبیدہ کے گھر پر کچھ احباب جمع تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا کہ ایک شخص نے آکر اطلاع دی کہ شراب حرام ہو گئی اور سوال و جواب کے بغیر لوگوں نے یکایک جام و سبو ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ تنہا ابوعبیدہ کے گھر کی کوئی تخصیص نہیں۔ جیسے جیسے خبر شہر میں گشت کرتی گئی لوگ اپنے اپنے گھروں سے شراب اٹھا اٹھا کر باہر پھینکتے گئے، یہاں تک کہ مدینہ کی گلیوں میں شراب بہنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے ملک عرب سے بادہ پرستی کا نام ونشان مٹ گیا، بعد میں اسلام جہاں جہاں پہونچا وہاں وہاں شراب کی ساخت و پرداخت اور خرید و فروخت کا قلع قمع ہو گیا۔

آج بھی جب کہ مسلمانوں میں دینی رجحان کمزور پڑ گیا ہے شراب سے پرہیز کرنے والوں کا جو اوسط ان میں ہے دنیا کی کسی قوم میں نہیں پایا جاتا ہے اور جو مسلمان اس گناہ کے مرتکب ہوتے بھی ہیں تو اُن میں سے اکثر اُسے بُرا سمجھتے ہیں اور چھپا کر پیتے ہیں۔

۲

پیغمبروں کا کام مصلحوں اور مقننوں کے کاموں سے بدرجہا بلند ہے۔ ان کا اصلی فرض دینی ہدایت اور رہبری ہے یعنی لوگوں کو اوہام و خرافات سے نجات دلا کر رب العلمین سے ان کا رشتہ جوڑنا ـــــ جتنے بھی نبی آئے انھوں نے اسی اصول کو اپنی دعوت کا محور بنایا۔ ارشادِ قرآنی ہے کہ:۔

وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ	اپنے سے پہلے رسولوں کے حالات معلوم
مِنْ رُّسُلِنَا اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ	کرو کہ کیا ہم نے کبھی اور کسی کو بھی ذات

الرحمٰنِ اٰلِھَۃً یُّعْبَدُوْنَ ۔ (القرآن۔ زخرف) پاک رحمٰن کے علاوہ معبود ٹھہرایا جس کی لوگ عبادت کیا کریں۔

ان مقدس ہستیوں کو اللہ کی وحدت و وحدانیت تسلیم کرانے میں کسقدر کامیابی ہوئی اسکا اندازہ مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں پر نظر ڈالنے سے بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کی مسجدوں کے علاوہ کوئی عبادت گاہ ایسی نہیں ہے جہاں کسی نہ کسی شکل میں شرک موجود نہ ہو اور لطف یہ ہے کہ تمام معبدوں میں مسجدیں ہی سب سے زیادہ معمور ہیں۔ کہیں ہفتہ میں ایک بار جانا ضروری ہے۔ کہیں ہفتہ میں دوبار اور کہیں زیادہ سے زیادہ دن میں ایک بار لیکن مسجدوں میں دن میں پانچ وقت کی حاضری ضروری ہے۔ اسکے علاوہ مساجد میں نہ زینت و آرائش کا کوئی سامان ہوتا ہے، نہ ساز و نغمہ کا اہتمام اور نہ تصور جمانے کے لئے کسی مادی شے کا انتظام پھر بھی سب سے زیادہ عبادت گذار انہی میں ملتے ہیں۔

آنحضرت صلعم نے باطنی تصرف کے ساتھ عقلی براہین سے بھی کام لیا اور شرک کی شہرگ پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ مسلمانوں کو ان اطراف سے خطرہ نہ رہا۔ آپ نے وحدانیت کی حقیقت پوری طرح بے نقاب کر دی۔ توحید فی الذات توحید فی الصفات، توحید فی العبادت، توحید فی الاستعانت، توحید فی العلم توحید فی القدرت اور توحید فی التصرف کے الگ الگ عنوان قائم کئے اور ہر عنوان کے تحت میں مسائل پر ایسی بھرپور روشنی ڈالی کہ وقت کے الٹ پھیر ان میں ابہام پیدا کرنے سے معذور ہو گئے۔

یہی سبب ہے کہ دنیا کی تمام قوموں میں صرف مسلمان ہی خدا کی یکتائی اور

بے مثالی پر مکمل عقیدہ رکھتے ہیں۔ باقی تمام مذہبی جماعتوں میں خدا کی ناقابل تعین ذات کو کسی نہ کسی طرح حدِ تعین میں لانے کی کوشش نمایاں ہے۔ کہیں وحدت سے کثرت کی طرف مراجعت ہے، کہیں تثلیث کا چرچا ہے، کہیں ثنویانی نقطۂ نظر کی حمایت ہے۔

تمام مذاہب کی بنیاد رکھنے والوں میں صرف آنحضرت صلعم ہی پوری طرح پر انسان نظر آتے ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ دوسرے انبیاء انسانوں کے علاوہ کچھ اور بھی تھے لیکن انکی حیثیتیں انکی امتوں میں اتنی واضح نہ ہوسکیں کہ ان کے پیرو انکو انسانوں کے علاوہ کچھ اور بھی سمجھنے کی غلطی سے بچ سکتے۔ آپنے الوہیت اور نبوت میں ادنیٰ سی بھی مشابہت نہ پیدا ہونے دی۔ اسی لئے جب کہ اکثر مذاہب اپنے بانیوں کے نام سے منسوب ہوئے آپ کا پھیلایا ہوا دین صرف اسی نام سے مشہور ہوا جو خدا نے اسکے لئے تجویز فرمایا تھا۔ یہ بھی آپ کی فریضۂ نبوت کی کامیاب ادائیگی کی ایک روشن دلیل ہے۔

آٹھواں مقالہ

سرورِ کائناتؐ

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ

(اے محمد! ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لئے بھیجا ہے۔ القرآن سبا)

کائنات کی سروری کیا ہے؟ کائنات کو اس حکمتِ بالغہ کا عرفان عطا کرنا جو اسکے کارخانہ کو ازل سے چلا رہی ہے۔

اس عجیب وغریب کائنات، اس گوناگوں عالم کا ہیرو ابن آدم ہے جس میں خدا نے اپنی صفاتِ کاملہ کا عکس جلوہ گر کیا ہے ——— ان اللہ خلق آدم علیٰ صورتہٖ یہ اوصافِ اخلاقِ انسانی کا معیار ہیں اور ابتدائے آفرینش سے دنیا کے تمام معلموں اور محسنوں نے ان ہی کا درس دیا ہے۔

دنیا کی درسگاہ میں انبیاء اور اولیاء سے لے کر مدبروں اور خوش فکروں تک سبھی کے نام ملتے ہیں۔ انھوں نے نوع انسانی کی سطح بلند کرنے کی اپنے اپنے طرز پر کوششیں کیں۔ ہم پر ان سب کا احسان ہے۔ لیکن سب سے زیادہ ممنون ہم ان نفوس قدسیہ ہی کے ہیں جن کو انبیائے کرام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

آج الحاد اور مادیت کے کارخانوں سے نکلے ہوئے سانچے رسولوں کی عظمت اور انکی تعلیم کی اہمیت کو مسخ کرنے کے درپے ہیں۔ لیکن کوئی ان سے یہ پوچھے کہ حریت اور عدل، اخوت اور انسانی ہمدردی کی جو بھی جھلک ان کے عقائد و نظریات میں ملتی ہے وہ کس کی نور پاشی کا صدقہ ہے؟ غور و فکر، تجربہ و تجزیہ، جہد و ستیز، جو ان کے افق کے روشن ترین ستارے ہیں وہ انھوں نے پائے کہاں سے ہیں؟

وہمی و قیاسی مباحث سے قطع نظر، عملی حیثیت سے بھی انسان کے سرمایہ میں پُر مسرت اور کامیاب زندگی کے جو بھی اثرات و نتائج پائے جاتے ہیں وہ انبیاء کے مقدس گروہ ہی کے فیوض و برکات ہیں۔ وقت کے شاہراہ پر جو نقش قدم وہ چھوڑ گئے ہیں، دنیا ان ہی پر چل کر اپنی منزل تلاش کر رہی ہو اور جب وہ راستہ سے بھٹک جاتی ہے تو یہی نقوش اسکی رہنمائی کر کے اُسے اندھیرے سے اُجالے کی طرف لاتے ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے بالکل صحیح اور واقعہ کے عین مطابق فرمایا ہے کہ "آج بھی جہاں عدل و میزان کا وجود ہے وہ کسی یونانی حکیم یا یورپین فلاسفر کی تعلیم و تصنیف اور تقریر و خطبہ کا اثر نہیں ہے، بلکہ طبقہ انبیاء ہی کی بے واسطہ

یا بواسطہ تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں کیسے ہی بدترین مبلّغ ہی، مگر نیکی، احسان، عدل، ہمدردی، نکوکاری، حُسنِ خلق کی تعلیم، تبلیغ اور دعوت ان ہی کی زبانوں سے ہو رہی ہے جو رسولوں کے پیرو اور پیغمبروں کے تابع ہیں ـــــــ جو عقیدہ کے ملحد ہیں انکی بھی نکوکاری ان ہی پیغمبروں کے نادانستہ فیضانِ تعلیم کا نتیجہ ہے اس بنا پر جو لوگ ذہنی طور پر پیغمبروں کے منکر ہیں وہ بھی عملی طور پر انکی تعلیم کے مقر اور معترف ہیں۔[۱]

مختصر یہ کہ اگر عالمگیر رہنما یا جگت گرو کی تلاش مقصود ہو اور انسان عارضی تاثرات اور اضطراری کیفیات سے بلند ہو کر تاریخ وتمدن کا بے تعصبی اور فراخدلی سے مطالعہ کر سکے اور ماضی کی روشنی میں مستقبل کی کسی حد تک رو کشائی ممکن ہو تو نظرِ انتخاب صنفِ انسانی کے ان ہی پاک طینت، بلند فطرت ہادیانِ حق پر پڑے گی جنھیں ہم نبی یا رسول کہتے ہیں۔

اب ذرا دنیا کی رہنمائی اور کائنات کی سروری کے متعلق اپنے ذہنوں کو صاف کرتے چلیں تو بہتر ہو گا۔ دنیا کا لیڈر وہی ہو سکتا ہے جس نے تمام ملکی اور نسلی اور طبقاتی قیدوں سے بلند ہو کر کل انسانی برادری کی بہبودی اور بھلائی اپنے سامنے رکھی ہو۔ ایک محبِ وطن یا قومی لیڈر اس اعتبار سے ضرور لائق احترام ہے کہ اس نے اپنے ملک و قوم کی بے لوث خدمت کی، ایثار کیا، تکلیفیں جھیلیں، عزم راسخ اور سیاسی فراست کے بہترین نمونے دکھائے،

---

[۱] سیرۃ النبی، جلد ۴۔ صفحہ ۲۰۶

غیروں کے جور اور اپنوں کے شر کا کامیاب مقابلہ کیا، ایک مضبوط حکومت قائم کی، معاشرتی اصلاحیں جاری کیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسکی غیر معمولی شخصیت کی کچھ کرنیں سیاسی اور جغرافیائی سرحدیں عبور کر کے بعض دوسرے علاقوں میں بھی نوید صبح لے کر پہونچی ہوں۔ مثلاً ابراہم لنکن، لینن، اسٹالن، مصطفےٰ کمال، گاندھی، جناح وغیرہ سے انکی قوموں سے نہ تعلق رکھنے والے بھی بعض طبقے عقیدت رکھتے ہیں۔ لیکن ان قومی محسنوں کو دوسری قومیں تو اپنا لیڈر نہیں مان سکتیں۔ روس اور چین میں آجکل کتنا نظریاتی اتحاد اور تعاون پایا جاتا ہے۔ مگر کیا روسی ماؤزے تنگ کو اپنا قومی لیڈر تسلیم کرنے پر آمادہ کئے جا سکتے ہیں؟ بات صاف ہے۔ جس شخص کی محبت، خیر خواہی اور کارکردگی اس کے اپنے وطن تک محدود ہو، دوسرے ممالک اسے اپنا رہنما کیوں مانیں؟ ساری قوموں کا لیڈر تو وہی ہو سکتا ہے جس کے پاؤں میں نسل وجغرافیہ کی زنجیریں نہ ہوں، جس کی نظر میں سارے انسان ایک ہوں، جس کے دل میں سب کا یکساں درد ہو اور جو اپنے فکر و عمل کے پھل تقسیم کرتے وقت اپنے اور پرائے کا فرق روا نہ رکھتا ہو۔

دوسری اہم شرط یہ ہے کہ اسکی تعلیم زندگی کا کوئی ایک رخ نہیں بلکہ پوری تصویر پیش کرتی ہو۔ اس کا کردار انسانی فطرت کے جلوۂ صد رنگ کا مظہر ہو۔ اس کے اصول انسانی فطرت کے تمام پہلوؤں ——— اسکی طاقتوں اور کمزوریوں ——— کا احاطہ کرتے ہوں، اور انکی حیثیت علمی یا فلسفیانہ نہیں بلکہ سراسر عملی ہو۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اسکی رہنمائی کسی خاص زمانہ میں نہیں بلکہ ہر زمانہ اور ہر حال میں مفید، صحیح اور قابل عمل ہو، اس کا پیغام خزاں ناآشنا ہو، وقت

اس کے اصول قلمزد نہ کر سکے۔ اس کا دریائے فیض ہمیشہ جاری رہے۔ اسکی تربت گاہ کے دروازے کبھی بند نہ ہوں۔ جس کی قیادت ایک زمانہ میں نفع رساں اور دوسرے میں بیکار ہو، اسے دنیا کا قائد نہیں کہا جا سکتا۔ دنیا کی سروری تو اسی کا حصہ ہے کہ جب تک دنیا قائم رہے۔ اسکی سروری بھی کارآمد رہے۔

لیکن دنیا سرائے فانی ہے۔ مقدس سے مقدس ہستیاں، کامیاب سے کامیاب زندگیاں، شاندار سے شاندار کارنامے بقا و دوام کی دولت سے محروم ہیں۔ آئندہ نسلوں کو جو بھی ہدایت و رہبری مل سکتی ہے وہ صرف سیرت و تواریخ ہی کے ذریعہ۔ چنانچہ وہ نمونۂ حیات جو انسانوں کے لئے ایک دائمی معیار کا کام دے سکے، اس کے لئے ضروری ہے کہ انسانوں کے سینوں اور سفینوں میں ہمیشہ محفوظ رہے۔ اسکے سارے خدوخال تاریخ کے اعتبار سے معتبر ہوں۔ اگر انکی نوعیت قصوں، اور کہانیوں کی ہوئی تو وہ مفید نہونگے۔ ہم ان ہی باتوں سے متاثر ہوتے ہیں جنکی صداقت اور واقعیت کی بابت، ہمارے دلوں میں شبہ نہیں گزرتا۔ اسی لئے تاریخی واقعات میں جو طبیعتوں کو ابھارنے کی صلاحیت ہے وہ افسانوں اور حکایتوں میں نہیں پائی جاتی خواہ انھیں کتنے ہی مؤثر اور دلکش پیرایہ میں کیوں نہ بیان کیا جائے۔

ثانیاً اس معیاری رہنما کے صحیفہ حیات کے تمام اجزاء ہمارے سامنے ہونا چاہئیں، اسکی زندگی کے چھوٹے بڑے کل واقعات اور اسکی تعلیم کی مکمل تفصیل تاریخ میں محفوظ ہوگئی ہو تاکہ ہر زمانہ کے لوگ اسکی زندگی کا مطالعہ بالکل اس طرح کر سکیں جس طرح اسکے ساتھیوں اور پڑوسیوں نے اسکی زندگی میں کیا تھا۔

ایک اور شرط یہ ہے کہ اس مردِ کامل نے صرف اصول پیش کر دینے پر اکتفا نہ کیا ہو، بلکہ اپنی تعلیم اور ہدایت کو زندگی میں عملاً جاری کر کے بھی دکھایا ہو اور ان اصولوں کی بنیادوں پر ایک جیتی جاگتی سوسائٹی پیدا کر دی ہو۔

دنیا میں معصوم اقوال، پاکیزہ نصیحتوں اور بلند پایہ فلسفوں کی کمی نہیں؛ لیکن اسکے باوجود پر امن زندگی کی آرزو بس آرزو کی حد سے نہیں بڑھ پاتی۔ انسان نظریوں اور فلسفوں سے نہیں، عمل سے بنتا ہے، ویسے باتیں تو سبھی بنالیتے ہیں۔

اگر کسی نظریہ یا فلسفہ کو کامیاب ہونا ہے تو اسکے پیچھے کسی عملی سیرت کا ہونا ضروری ہے جو اسکی تعلیم اور اصولوں کو خود میں جذب کر کے دنیا کے لئے ایک چلتا پھرتا آئینہ بن جائے اس سلسلہ میں علامہ سید سلیمان ندوی نے مشہور شاعر اور مفکر رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ اپنی ایک گفتگو کا واقعہ نقل کیا ہے۔ علامہ ندوی اور شاعر ٹیگور ۱۹۲۴ء میں ایک ہی جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ ایک نشست میں برہمو سماج کا ذکر نکل آیا۔ ٹیگور سے ان کے ایک ہمسفر نے اسکی ناکامی کا سبب دریافت کیا۔ وہ حاضرہ فلسفہ، تمدن اور ماحول دیکھ کر بنایا گیا تھا۔ اس میں کوئی بات عقل و منطق کے خلاف نہ تھی۔ اسکے اصول منصفانہ اور صلح کل تھے اور اسکی تعلیم تھی کہ کل مذاہب سچے اور انکے بانی نیک اور اچھے لوگ تھے۔ تاہم وہ ترقی نہ کر سکا۔ ٹیگور نے جواب دیا کہ اسکے ترقی نہ کرنے کا اصل سبب یہ تھا کہ ''اسکی پیچھے کوئی شخصی زندگی اور کوئی عملی سیرت نہ تھی جو ہماری توجہ کا مرکز اور ہماری نکوکاری کا نمونہ بنتی۔''[۱]

---

[۱] خطبات مدراس، صفحہ ۱۹/۲۰

اور آخر میں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مردِ جلیل خود ایک زبردست شخصیت کا مالک ہی نہیں، بقول مولانا مودودی اپنی شخصیت کو پگھلا کر دوسروں کے قالب میں اتار دینے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔ وہ صالح بھی ہو اور مصلح بھی، کندن بھی اور کیمیا بھی۔ چراغ وہی سرچشمۂ نور کہا جائے گا۔ جو اپنی لو سے چھوٹے بڑے سیکڑوں چراغ روشن کر دے، اور جو ایسا نہ کر سکے وہ خود خواہ کتنی ہی روشنی کا حامل کیوں نہ ہو اسکی ضیا گستری بس اسکے دم تک ہی رہے گی۔

۲

آئیے اب ان معیاروں پر نبوتِ محمدی کو جانچیں، اعتقادی اعتبار سے نہیں، تاریخی اعتبار سے، دوسرے انبیاء کی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب صرف ایک قوم یا ایک ملک کے باشندے نہ تھے۔ آپ کا خطاب تمام انسانوں اور پورے انسانی ضمیر سے تھا۔ ایک شخص اپنے آقا، رہبر، ہادی یا پیغمبر کی تعریف میں دفتر کے دفتر لکھ سکتا ہے۔ لیکن واقعات بہرحال واقعات ہیں۔ انکی آواز دبائی تو جا سکتی ہے مگر مٹائی نہیں جا سکتی۔ حضرت موسیٰ نے حضرت یعقوب کی اولاد کو مصر کی غلامی سے بیشک آزاد کرایا ـــــ لیکن حضرت یعقوب کی اولاد ہی کو تو۔ حضرت عیسیٰ نے "جنت میں ہمارا باپ" کی ضرور تبلیغ کی ـــــ مگر "ہمارے" سے مراد بس بنی اسرائیل ہی تو تھے۔ مسیحی مبلغوں نے حضرت عیسیٰ کے بعثت کے دائرہ کو اب بے حساب وسعت دیدی ہے جس کا اپنی زندگی میں آپ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ورنہ آپ یہ نہ کہتے کہ "میں اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی اور کے پاس نہیں

بھیجا گیا" یا "مناسب نہیں کہ اسرائیل کے لڑکوں کی روٹی (انکا مذہب) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینکدوں" ——— اور نہ یہ فرماتے کہ "اپنے موتی سوروں کے آگے مت پھینکو"[لہ]

اسکے برخلاف آنحضرت صلعم کی بعثت ساری دنیا کا سرمایہ سعادت ہو. قرآن مجید میں دعوت اسلام کی عالمگیری کا جا بجا اعلان کیا گیا ہے جو ہم کو کسی دوسرے مذہب کی بابت اسکے صحیفوں میں نہیں ملتا.

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ (اعراف)	اے محمدؐ! ان سے کہدو کہ اے فرزندانِ آدم! میں تم سب کے لئے اللہ کا رسول ہوں، اس اللہ کا رسول جو زمین و آسمان کا مالک ہے.
وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ هٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ. (ابراہیم)	اے محمدؐ! ہم نے تم کو تمام دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے. یہ قرآن تمام انسانوں کے لئے پیغام ہے.

چنانچہ جتنا گہرا اور عالمگیر اثر آپنے نوع انسانی کی تاریخ و تقدیر پر ڈالا آج تک کسی دوسرے انسان کے حصّہ میں اسکا عشرِ عشیر بھی نہیں آیا. آپ کے چشمۂ فیض سے کوئی قوم بھی محروم نہیں رہی نہ عربی، نہ عجمی، نہ زنگی، نہ فرنگی نہ حبشی، نہ ہندی ——— اور یہ کسی پرجوش عقیدت مند کی مدح خوانی نہیں، ایک کھلی ہوئی تاریخی حقیقت ہے جس کا اعتراف تمام ہی انصاف پسند اور

[لہ] انجیل، متی.

بسا اوقات غیر انصاف پسند مبصروں نے بھی کیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر جے، ڈبلو، ڈریپر (J.W. DRAPER) لکھتے ہیں کہ "تمام انسانوں میں نسلِ انسانی پر سب سے زیادہ اثر محمدؐ نے ڈالا ہے"[1] یا، دنیا کے جدید مورخ ایڈورڈ گبن (GIBBON) کا اسلام کی بابت یہ قول "ایک ناقابل فراموش انقلاب جس نے کرۂ ارض کی تمام قوموں پر ایک نئے اور دائمی طرز کی اثر اندازی کی ہے"[2]

یہ آپکے پیغام کی عالمگیری ہی تو تھی جس نے تمام نسلی اور قومی امتیازات پاؤں تلے روندکر رکھ دیئے۔ رسول اللہ صلعم نے عالمگیر انسانی برادری، اور مساوات کا جو عملی تصور پیش کیا وہ اتنا عالم آشکارا ہو کہ یہاں اسکی تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ پروفیسر ٹوائن بی (TOYNBEE) نے رنگ و خون کی تفریقوں کے انسداد کو عالمی تہذیب پر اسلام کا ایک نہایت گرانقدر احسان قرار دیا ہے پچھلے مقالہ میں ہم اس پر بحث کر چکے ہیں۔

اسلام سے پہلے مسیحیت اور بدھ مت بھی مساوات کا تخیل پیش کر چکے تھے۔ مگر وہاں اسکی حیثیت محض ایک عالمانہ درس اور ایک فلسفیانہ تصوّر کی تھی۔ وہ انسانی وحدت کا کوئی عملی نظام وجود میں نہ لا سکے تھے۔ اسلام میں اسکی صورت بالکل مختلف تھی، یہاں انسانی برابری اور اُخوت کوئی شاعرانہ تخیل، یا فکری نظریہ نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت تھی۔

---

[1] HISTORY OF THE INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE

[2] ہسٹری آف دی ڈیکلائن اینڈ فال اور دی رومن امپائر۔ جلد ۵

رسول اللہ صلعم نے اور مسائل کی طرح نسلی تعصب کا بھی مقابلہ خالص عملی انداز میں کیا۔ اور عدم مساوات کے جملہ احتمالات کو ختم کر دیا۔ وحدت اسلامی میں داخل ہونے والے ہر شخص کو آپ ہی کے دور میں یکساں قانونی، شرعی اور اخلاقی حقوق حاصل ہو گئے تھے۔ یہ طریقہ اسلامی عروج کی تمام صدیوں میں رائج رہا، اور آج مسلمانوں کے تنزل و انحطاط کے عہد میں بھی برابری اور برادری کے جو مناظر ان کے اجتماعوں میں نظر آتے ہیں، کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتے۔ خانۂ کعبہ اور مسجد نبویؐ سے لے کر چھوٹے چھوٹے مسلم گھرانوں کی جانمازوں تک اور دسترخوانوں سے لے کر قبرستانوں تک عربی و عجمی، ہندی و حبشی، شاہ و گدا اور امیر و غریب کا کوئی فرق نہیں ملتا ہے۔

خود دربار نبوی مختلف نسلی و ملکی پھولوں کا گلدستہ تھا۔ اس میں عداس نینوائی، صہیب رومی، ذوالکلاع حمیری، ابو سفیان اموی، کرز فہری، بلال حبشی، ضماد ازدی، عدی طائی، ابوذر غفاری، ابو حارث مصطلقی، سلمان فارسی، طفیل دوسی، ثمامہ نجدی، ابو عامر اشعری، سراقہ مدلجی، پہلو بہ پہلو بیٹھے نظر آتے تھے اور ہر شخص اپنے ملک اور اپنی قوم کی نمائندگی کرتا تھا۔

بقول ڈاکٹر رائیڈن (DR. MOUDE ROYDEN) "پہلی حقیقی جمہوریت جس کا تصور ذہن انسانی میں پیدا ہوا اس کا اعلان محمدؐ کے مذہب ہی نے کیا۔"

دوسری شرط جامعیت کی ہے، زندگی خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی اسکے جسمانی، جذباتی، نفسیاتی، معاشرتی، اخلاقی، ذہنی، روحانی ——— غرضکہ بہت سے پہلو ہیں جو ایک دوسرے کے اندر اس طرح سمائے ہوئے ہیں کہ انکو

الگ الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کے حریف نہیں معین ہیں اور اپنے اپنے کام انجام دیکر ایک دوسرے کی بقا و ترقی میں مدد دیتے ہیں۔ ہم ان میں ایک کی خاطر دوسرے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس لئے ایک دائمی اور عالمی معلم کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا سایہ ان تمام پہلوؤں پر پڑے اور اصلاحات انسانی کا کوئی شعبہ ایسا نہ بچ رہے جس کی تکمیل اسکی تعلیم و عمل سے نہ ہو گئی ہو۔ یہ جامعیت ہم کو پیغمبر اسلام کے علاوہ کسی اور پیغمبر کے یہاں نہیں ملتی۔ اس میں شک نہیں کہ خدا کے تمام پیغمبر معیاری شخصیتوں کے حامل تھے۔ لیکن ایک تو آنحضرت صلعم کے سوا باقی کل پیغمبروں کی سیرت اور مستند واقعات زندگی کے بارہ میں خود ان کے مذاہب اور قومیں اتنی بے بضاعت اور تہی مایہ ہیں کہ انکے مشاغل، تعلیم اور ماحول کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، اور دوسرے انکو انسانی زندگی کے ان تمام گوشوں سے ہو کر گذرنا نہیں پڑا جن میں انکی فطرت و کردار کی مختلف خوبیوں کو ——— جو یقیناً ان میں موجود ہونگی ——— منظر عام پر آنے کا موقع ملتا۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخی شخصیتوں پر جب اس پہلو سے نظر ڈالی جاتی ہے تو علاوہ پیغمبر اسلام کی جامع اوصاف ذات کے باقی سب کی زندگیوں میں ایک جگہ ہی لیتا ہوا خلا نظر آتا ہے۔ کوئی نظریات کا بادشاہ ہے مگر عمل کی قوت نہیں رکھتا، کوئی عمل کا پتلا ہے مگر فکر میں کمزور ہے۔ کسی کے کمالات سیاست و تدبر تک محدود ہیں۔ کوئی محض فوجی ذہنیت کا مظہر ہے، کسی کی نظر اجتماعی زندگی کے چند پہلوؤں پر ایسی پڑی کہ باقی پہلو اوجھل ہو گئے۔ کسی نے اجتماعیت کے آستانہ پر انفرادیت کو قربان کر دیا،

کسی نے انفرادیت کو ایسا ابھارا کہ خاندان اور معاشرہ کے رشتوں کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا۔ کسی نے روحانیت اور اخلاق کو نظر انداز کر دیا۔ احکام کی تفصیل، انضباط اور ہمہ گیری صرف اسلام کا حصّہ ہے۔

آنحضرت صلعم کی ذاتِ اقدس میں انسانی زندگی کی تمام حیثیتیں جمع تھیں "آپ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد و عابد، اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے۔"[1]

آپ ابراہیم و موسیٰ بھی تھے اور یعقوب و ایوب بھی۔ داؤد و سلیمان بھی تھے اور یحییٰ و عیسیٰ بھی، باسورتھ اسمتھ (BOSWORTH SMITH) نے لکھا ہے کہ "آپ ایک سہ گانہ موسّس تھے۔ آپنے ایک مذہب، ایک تہذیب اور ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی۔"[2]

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دوسرے بانیانِ مذہب جامعیت کبریٰ سے خالی تھے اسی طرح انکی زندگی کے صحیفوں کی تصویریں بھی نامکمل لی گئیں۔ زیادہ تر کی زندگیاں تو قیاس و افسانہ کے دھندلکوں میں گم ہو گئی ہیں، لیکن پیغمبرِ اسلام کی سیرت تاریخی اعتبار سے اس درجہ معتبر ہے کہ ساری دنیا اسکی معترف ہے اور مسلمانوں کے اس دعویٰ کا کوئی بھی حریف نہیں

---

[1] سیرۃ النبی، ج ۶، ص ۳۷۔

[2] MOHAMMAD AND MOHAMMADANISM

ہو سکا کہ انھوں نے اپنے نبی کے حالات ایک طرف اس وسعت اور تفصیل کے ساتھ قلمبند کئے کہ شکل وشباہت، وضع و قطع، رفتار و گفتار، اقوال وافعال، عادات واطوار، طرز زندگی اور طریق معاشرت کی ایک ایک بات محفوظ ہو گئی، اور دوسری طرف صحت کا ایسا انتظام کیا کہ کسی آسمانی کتاب کے لئے کبھی نہ ہو سکا۔

پیدائش سے لے کر وفات تک آنحضرت صلعم کی کل زندگی آپ کے مشاغل اور ارشادات کی مکمل تفصیل کے ساتھ سیرت و تواریخ کی انتہائی مستند کتابوں میں محفوظ ہے جن کے ذریعہ آپ کی ذات وصفات کا اس سے کہیں زیادہ علم حاصل کیا جا سکتا ہے جتنا کہ لوگ عموماً اپنے بزرگوں اور دوستوں کے متعلق جانتے ہیں۔ خواجہ کمال الدین نے یہ جو لکھا ہے کہ "میں بہت سی حیثیتوں سے اپنے والدین سے زیادہ آپ سے واقف ہوں" تو اس میں قطعی کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے مسلمان قسم کھا کر یہی عرض کر سکتے ہیں۔

عہد نبوی کی تصویر کو باقی اور نبوت کے کلام اور ماحول کو محفوظ رکھنے کے لئے محدثین نے کس طرح اپنی زندگیاں وقف کر دیں، کیا کیا مشقتیں جھیلیں اور کیسے کیسے دشوار سفر کئے اور راویوں اور روایتوں کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے انھوں نے کیسے سخت سے سخت اصول مرتب کئے اس کی تفصیل کے لئے نہ تو ہمارے مقالہ میں گنجائش ہے اور نہ یہ اسکا موضوع ہے۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ انھوں نے اسکی خاطر عربی ادب میں اسماء رجال اور فن روایت کے ایک نئے اور مستقل شعبہ کا اضافہ کر دیا، اور چھوٹی سے چھوٹی بات کی تحقیق کے لئے کوئی انسانی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ جان ڈیون پورٹ (JOHN DAVENPORT)

کی کتاب (APOLOGY FOR MOHAMMAD AND THE KORAN) کے افتتاحی
الفاظ یہ ہیں کہ "اس میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام مقنّنوں اور فاتحوں میں ایک بھی ایسا نہیں
جس کے سوانح حیات محمدؐ کے سوانح حیات سے زیادہ مکمل اور سچے ہوں۔"

اور آر، وی، سی، باڈلے (R.V.C. BODLEY) کا یہ کہنا ہے کہ:۔

"ہمارے پاس موسیٰؑ، کنفیوشیس، یا گوتم بدھ کا کوئی معاصرانہ ریکارڈ نہیں ہے
اور نہ عیسیٰ کی زندگی کے بس ایک جزو کے چند اجزا ہم جانتے ہیں۔ انکی زندگی کے ان
تیس برسوں کا جنھوں نے آخری تین برسوں کے لئے راستہ ہموار کیا ہم کو کچھ علم نہیں ہے۔
مگر محمدؐ کی کہانی انتہائی روشن ہے۔

"یہاں اسرار اور پرچھائیاں نہیں، تاریخ ہے ہم محمدؐ سے ویسے ہی واقف
ہیں جیسے کہ اپنے کسی قریب العہد شخص سے۔ ان کا خارجی ریکارڈ ـــــ انکی
جوانی، ان کے اعزا، ان کے عادات و اطوار ـــــ نہ تو افسانہ ہے نہ سُنی سنائی
بات، اور نہ انکی بعثت کے بعد کا انکا داخلی ریکارڈ کسی مغلق یا مشوش واعظ کی
دھندلی روایت۔ ہمارے پاس انہی کے ہمعصروں کا قلمبند کیا ہوا انکا ایسا ریکارڈ
ہے جو اپنے آغاز اور تحفظ دونوں لحاظ سے قطعی یکتا ہے، اور جس کی سچائی کے
متعلق ایک بھی سنجیدہ شبہ ظاہر کرنا کسی کے لئے ممکن نہیں ہو سکا ہے۔"

یہی مصنّف ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ:۔

"عیسیٰؑ کے سوانح کا سب سے زیادہ مایوس کن پہلو انکی ابتدائی عمر اور نوجوانی
کے حالات کی تفصیل کا فقدان ہے، ہم اُنکی پیدائش کی بابت سنتے ہیں، اور پھر
یکایک وہ تیس برس کے ہو کر معجزے دکھانے لگتے ہیں۔ پھر تین برس بعد وہ مر جاتے ہیں۔

موسیٰؑ کی سیرت کی بھی یہی کمزوری ہے ———— ہم انکی زندگیوں کے صرف اِن حصّوں سے واقف ہیں جب وہ عروج پر پہونچ چکے تھے۔ اسکے قبل کے اوراق بالکل سادہ ہیں۔ اس بات نے اور اسی کے ساتھ ان کے شیشہ، لکڑی اور پتھر کے مجسموں نے ان کو تقریباً دیو مالا اور مابعد الطبیعات کے کردار بنا دیا ہے۔ محمدؐ اوروں کے مقابلہ میں دیر میں تاریخ گری کا کام شروع کرتے ہیں۔ لیکن جو معلوم کرنا چاہیں ان کے لئے، اُن کے اس سے قبل کے حالات بالکل چھپے یا ڈھکے نہیں ہیں۔"[۱]

قرآن مجید کے ساتھ سیرت وحدیث کے ذخیروں کا اس طرح محفوظ رہنا اسلام کا اعجاز اور اس کا ایک ایسا امتیاز ہے جس میں کوئی مذہب اور کوئی امت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ ایڈورڈ گبن (EDWARD GIBBON) لکھتے ہیں کہ "آپ کے مذہب کی جو چیز واقعی حیرت انگیز ہے وہ اسکی اشاعت نہیں بلکہ اس کا ثبات اس کی پائیداری اور اسکی شانِ دوام ہے، جو صاف اور سادہ نقش آپنے مکہ اور مدینہ میں کندہ کیا تھا بارہ صدیوں کے انقلابات کے بعد آج بھی قرآن کے ہندی، افریقی اور ترکی نو معتقدوں کے پاس اسی طرح محفوظ ہے، اگر ایسا ہوسکے کہ حضرت عیسیٰؑ کے حواری، سینٹ پیٹر یا سینٹ پال VATICAN (روم میں پوپ کی سرکاری قیام گاہ) لوٹ آئیں تو انکو غالباً اس مورتی کا نام دریافت کرنے کی ضرورت پڑے جس کی پوجا اسس

---

[۱] دا میسنجر، صــ۲ وصــ۲۳۴ (THE MESSENGER, THE LIFE OF MOHAMMAD)

عظیم الشان مندر میں ان عجیب وغریب رسموں کے ساتھ کی جاتی ہے"۔[1]

ہدایت اور تعلیم کا سب سے کارگر اسلوب یہ ہے کہ صرف زبان سے نہ کہا جائے بلکہ جن اصولوں کی تعلیم دینا ہو انکو اپنی ہی زندگی میں جذب کر کے ایک عملی نمونہ ایک قدم آدم درس بنکر بھی لوگوں کے سامنے آجایا جائے کیونکہ انسان بہرحال کانوں کے ذریعہ کم اور آنکھوں کے ذریعہ زیادہ سیکھتا ہے، اور اسکے بننے یا بگڑنے کا انحصار ان باتوں پر کم ہوتا ہے جو وہ سنتا ہے اور ان باتوں پر زیادہ جو وہ دیکھتا ہے۔

اسلام کے پیغمبر کا یہی دستور تھا۔ کبھی کوئی نصیحت آپ کی زبان سے نہ سنی گئی جس پر پہلے خود آپ نے عمل کر کے نہ دکھا دیا ہو، لوگوں کو یاد الٰہی کی ترغیب دی تو خود "دل بہ یار دوست بہ کار" کا مصداق بن گئے۔ نماز کی نصیحت فرمائی تو اپنا یہ عالم بنا لیا کہ آج تک کسی نمازی کو اسکے قریب بھی پہونچنے کی توفیق نہ ہو سکی۔ ساری ساری راتیں جا نماز ہی پر گزر جاتی تھیں اور کھڑے کھڑے پاؤں ورم کر آتے تھے۔ روزوں کی فرضیت کا اعلان کیا تو اوروں کے لئے ماہ رمضان کے تیس یا انتیس روزے فرض بتائے اور اپنا یہ حال کر لیا کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ روزہ رکھنے پر آتے تو معلوم ہوتا کہ اب کبھی افطار ہی نہ کریں گے۔ زکوٰۃ وخیرات کا حکم دیا تو خود ایسے کشادہ دست ہو گئے کہ جو پایا خدا کی راہ میں خرچ کر دیا۔ یہی شان زہد وقناعت، توکل وایثار، صبر وشکر، رحم وکرم حلم وبردباری، عفو ودرگزر وغیرہ کے باب میں تھی۔

---

[1] جلد ۵، صفحہ ۳۹۴ OP. CIT. VOL V

کائنات کی رہنمائی کا آخری معیار رہنما کی کیمیا اثری ہے، یعنی وہ غیر محسوس طاقت جو دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں کی تقدیریں پلٹ دیتی ہے وہ صلاحیتِ اکسیر صفت جو دوسروں کی صلاحیتیں اس طرح ابھار دیتی ہے کہ وہ خود حیران رہ جاتے ہیں، وہ وہبی استعداد جو خود ہی انقلاب کا سامان تیار کرتی ہے، خود ہی اس کی سمت کا تعین کرتی ہے اور پھر خود ہی زمانہ کو موڑ کر اسکی طرف لے جاتی ہے۔

گڈریوں اور چرواہوں کی ایک جاہل و ناشائستہ قوم جو جائز و ناجائز صحیح و غلط کی تمیز سے تقریباً نا آشنا تھی، جو خانہ جنگیوں کے لامتناہی سلسلہ میں اس طرح جکڑی تھی کہ قومی فلاح و بہبود کا تصوّر اسکے ذہن سے ہو کر بھی نہیں گزرپاتا تھا ایک برزخ کامل، ایک ہستیٔ جامع کے اثر سے یکایک دینی و دنیوی ترقی کی بلند ترین صدر گاہوں کو زینت بخشنے لگتی ہے اور اسکے خشک ریگستانی خطّے سے علم و حکمت، سعادت و قوت کے وہ سرچشمے پھوٹتے ہیں کہ اس وقت کی دریافت شدہ دنیا کے تینوں براعظم ان سے سیراب ہونے لگتے ہیں۔

ان کے مسخ شدہ ذہنوں میں ایسا شاندار انقلاب آیا کہ بے جان معرفت سے نکل کر وہ ایک ایسے واضح اور عمیق عقیدہ تک پہونچ گئے جو ان کے سارے انفرادی اور اجتماعی وجود پر حاوی تھا۔ اب وہ ہمہ وقت خدا کی بے پناہ قوت کو محسوس کرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے، چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں بھی اسی کی کارسازی پر نظر رکھتے تھے۔ اور اپنی اس نئی زندگی کو عنایت ربانی کی ایک خاص علامت سمجھتے تھے بقول سر ولیم میور (SIR WILLIAM MUIR) "ان کے نزدیک محمدؐ زندگی کے معلم تھے، بہ فضل ایزدی انکی نئی امنگوں کے مخزن تھے اور

وہ انکی مکمل اطاعت کرتے تھے۔[1]

اگر کبھی صفت بہیمی زور کرتی اور ان سے غلطی سرزد ہو جاتی تو اگرچہ ایسا موقع ہوتا کہ کوئی آنکھ دیکھنے والی نہ ہوتی اس گناہ کی یاد ان کو چین سے نہ بیٹھنے دیتی اور وہ خود جاکر قانون کے سامنے اقبال جرم کر لیتے اور سخت سے سخت سزا کے لئے اپنے کو پیش کر دیتے تاکہ خدا کی ناراضگی سے بچ سکیں اور آخرت میں سزا بھگتنے کے بجائے دنیا ہی میں بھگت لیں۔ معتبر اسلامی مورخین نے اس سلسلہ میں ایسے عجیب و غریب واقعات پیش کئے ہیں جن کی مثال اسلام کی دینی تاریخ کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتی ہے۔ ہم یہاں صرف دو واقعات نقل کرینگے۔

ایک روز ماعز بن مالک اسلمی رسول اللہ صلعم کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ "یا رسول اللہ مجھ سے خطا ہوئی ہے۔ میں زنا کا مرتکب ہو گیا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے پاک کروا دیں۔" آپنے انکو واپس کر دیا۔ دوسرے دن وہ پھر آئے اور کہنے لگے "یا رسول اللہ میں زنا کا مجرم ہوں۔" آپنے ان کو دوبارہ واپس کر دیا اور ان کے گھر والوں سے دریافت کرایا کہ انکی سمجھ میں کسی طرح کی خرابی تو نہیں یا کوئی عادت کے خلاف بات تو نہیں پائی جاتی۔ گھر والوں نے جواب دیا کہ "ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ سمجھدار اور اچھے خاصے آدمی ہیں۔" ماعز بن مالک پھر تیسری بار آئے۔ آپنے دوبارہ انکی دماغی حالت کے بارہ میں دریافت کرایا۔ جواب یکساں ملا۔ چوتھی بار جب وہ آئے تو آپنے نصف دفن

---

[1] لائف آف محمد (LIFE OF MOHAMMAD)

کروا کے سنگسار کر دینے کا حکم دیا۔[۱]

دوسرا واقعہ غامدیہ کا ہے۔ انھوں نے بھی ایک روز دربار نبویؐ میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ "یا رسول اللہ! مجھ سے زنا کی غلطی سرزد ہو گئی ہے طاہر کروا دیجئے"۔ آپنے انکو واپس کروا دیا۔ دوسرے روز پھر آئیں اور کہنے لگیں "آپ مجھے کیوں واپس کرتے ہیں۔ شاید اسی طرح جس طرح ماعز کو واپس کر دیا کرتے تھے۔ میں حاملہ بھی ہوں"۔ آپنے فرمایا "تو پھر جاؤ جب ولادت ہو جائے تب آنا"۔ ولادت سے جب فارغ ہوئیں تو پھر آئیں۔ بچہ کپڑے میں لپٹا ہوا تھا، کہنے لگیں "یہ میرا بچہ ہے"۔ آپنے فرمایا "جاؤ بچہ کو دودھ پلاؤ۔ جب یہ کچھ کھانے لگے تب لے کر آنا"۔ جب دودھ چھڑایا تو پھر آئیں۔ لڑکے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا۔ بولیں "اے اللہ کے نبی لیجئے، میں دودھ پلانے سے فارغ ہو گئی، اور یہ روٹی کھانے لگا"۔ آپنے لڑکا ایک مسلمان کے سپرد کیا اور حد قائم کرنے کا حکم دیا۔ انکے سینہ تک گڑھا کھودا گیا اور آپنے حکم فرمایا، لوگوں نے سنگسار کر دیا۔[۲]

کیا اس معلم اعظم کی کیمیا اثری کو کسی اور ثبوت کی حاجت ہے؟

رہی چراغ سے چراغ جلانے والی بات تو ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، ابوعبیدہؓ بن جراحؓ، خالدؓ بن ولیدؓ، سعد بن ابی وقاص، عمرو بن العاص جیسی تاریخ گر ہستیوں کے نام دربار محمدی کے علاوہ اور کہاں ملیں گے؟ اور یہ تو ایک بہت مختصر فہرست ہے، ورنہ زندگی کا کوئی

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب الحدود [۲] ایضاً

شعبہ ایسا نہ تھا جس کے بہترین نمونے آپنے تیار نہیں کر دیئے تھے۔

۳

ڈاکٹر جانسن (DR. JOHNSON) نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں خراج عقیدت ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"ان کا خالص تاریخی کردار، انکی سادی اور بے ریا انسانیت کہ میں انسانوں ہی میں سے ایک انسان ہوں ——— انکی وہ پُرجوش حقیقت پسندی جو سارے پُراسرار قسم کے دور از کار تخیلات کو نظر انداز اور مافوق العادت چیزوں کو رد کر دینے والی ہے، وہ مکمل جمہوری اور آفاقی تصور جس کے تحت انکا آسمانی بادشاہت کا تصور رونما ہوا تھا، جس پر انھوں نے انسانوں کے باہمی تعلقات کی بنیاد رکھی تھی، وہ قوت جس کا انحصار اخلاقیات پر تھا، ان کا وہ اعتماد جو انھیں زبان اور قلم پر تھا، یہ ساری چیزیں محمد (صلعم) کا رشتہ عہد جدید سے جوڑنے والی ہیں۔"[ا]

تاریخ کا موجودہ دور علم و عقل، سائنس و حکمت کا دور ہے، ظن و قیاس مائیتھالوجی، واہیٹرالوجی کا زمانہ ختم ہوگیا۔ اسلام کا طلوع دراصل اسی دورِ جدید کا طلوع ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا ظن و قیاس کے اندھیرے سے مشاہدہ و عرفان کی روشنی میں اسلام ہی کے دروازہ سے ہو کر آئی ہے اور پیغمبر اسلام اس دورِ جدید کے بانی ہیں۔ کتنا صحیح لکھا ہے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے "یہی وہ شخص ہے جس نے دنیا کا رخ وہمیت و عجائب پرستی اور

ADOPTED FROM, THE HOLY PROPHET AT A GLANCE [ا]

رہبانیت کی طرف سے ہٹاکر عقلیت وحقیقت پسندی اور منطقیانہ دنیاداری کی طرف پھیر دیا۔ اسی نے محسوس معجزے مانگنے والی دنیا میں عقلی معجزے سمجھنے اور انھی کو معیارِ صداقت ماننے کا مذاق پیدا کیا۔ اسی نے خرقِ عادت خدائی کے آثار ڈھونڈھنے والوں کی آنکھیں کھولیں اور آثارِ فطرت میں خدا کی نشانیاں دیکھنے کا خوگر بنایا۔ اسی نے عقل، اور حس اور وجدان کے امتیازی اصول انسان کو بتائے، مادیت اور روحانیت میں مناسبت پیدا کی، دین سے علم وعمل کا اور علم وعمل سے دین کا ربط پیدا کیا مذہب کی طاقت سے سائنٹفک اسپرٹ اور سائنٹفک اسپرٹ سے صحیح مذہبیت پیدا کی ــــــ"[1]

جامعیت اور کاملیت اور ہمیشہ محفوظ رہنے والی صفت رسول اللہ صلعم کی تعلیم پر ختم ہے بقول علامہ سید سلیمان ندوی "جس طرح اسلام کا خدا رب العالمین (تمام دنیا کا پروردگار) ہے اسی طرح اس کا رسول رحمۃ للعالمین (تمام دنیا کے لئے رحمت ہے) اور اس کا پیغام تمام دنیا کے لئے پیغام ہے"[2]

تَبَارَكَ الَّذِی نَزَّلَ	برکت والا ہو وہ اللہ جس نے اپنے
الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ	بندہ پر فیصلہ والی کتاب اتاری
لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا	تاکہ وہ تمام دنیا کو ہشیار کرنیوالا ہو۔ وہ
الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ	خدا کہ اسکی سلطنت ہے آسمانوں اور
وَالْاَرْضِ (فرقان)	زمین کی۔

---

[1] نبوت محمدی کا عقلی ثبوت۔ ص ۱۲ [2] خطبات مدراس، ص ۱۴۹

یہ ہے کائنات کی سروری اور یہ ہیں سرورِ کائنات!

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ

صَلٰوۃً وَّسَلَامًا دَائِمًا اَبَدًا

ضمیمہ (۱)

چند خطبے

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ
وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ

"لوگوں کو دعوت دو اپنے پروردگار کی طرف حکمت سے
اور اچھی نصیحت سے"۔ ——————— (القرآن)

عرب فنِ خطابت میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ دراصل عربی زبان اپنے الفاظ اور محاوروں کے وسیع ذخیروں، شستہ ترکیبوں، شاندار بندشوں، چھوٹے چھوٹے فقروں میں وقار اور سنجیدگی کے ساتھ ترنم کی آمیزش اور دوسری صوتی و معنوی خوبیوں کے باعث تقریر و خطابت کے لئے دنیا کی تمام زبانوں میں زیادہ موزوں اور مناسب بھی ہے

اسلام سے پہلے بھی جب عربستان تمام تر جہالت وجاہلیت کی لپیٹ میں تھا وہاں زباں دانی کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ ناخواندہ لوگ اعلیٰ درجے کی شاعری کرتے تھے اور ہر قبیلہ فصاحت وبلاغت میں دوسروں پر سبقت لے جانے کی کوشش میں رہتا تھا۔ دو قبیلے، قریش اور بنو ہوازن اس بارہ میں بالخصوص ممتاز تھے۔ قریش خود آنحضرت صلعم کا قبیلہ تھا اور ہوازن کی ایک شاخ بنو سعد میں آپ کی پرورش ہوئی تھی، چنانچہ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "میں تم میں فصیح تر ہوں۔ قریشی ہوں اور میری زبان بنو سعد کی زبان ہے"[1]۔

وعظ وپند اور ارشاد وہدایت کے لئے آپ اکثر خطبے دیا کرتے تھے۔ خطابت کا انداز نہایت سادہ تھا۔ جب خطبہ دینے آپ حجرہ سے تشریف لاتے تو نہ کوئی خاص لباس پہنے ہوتے اور نہ امتیاز واعزاز کا کوئی اور سامان ہی ہوتا۔ نہ ہراول ہوتے، نہ نقیب، مسجد میں خطبہ کے وقت دستِ مبارک میں عصا ہوتا تھا اور میدانِ جنگ میں خطبہ دینے کھڑے ہوتے تو کمان پر ٹیک لگا لیتے تھے۔ ابن قیم نے لکھا ہے کہ آپ نے خطبہ کی حالت میں کبھی تلوار ہاتھ میں نہیں لی[2]۔

جمعہ اور عیدین کے خطبے ضروری تھے۔ ان کے علاوہ خطبہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا جب ضرورت پیش آتی، آپ لوگوں کو جمع کر کے مخاطب فرمایا کرتے تھے۔ ہمیشہ حمد خداوندی سے خطبہ شروع کرتے۔ عموماً خطبے نہایت مختصر ہوتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ نماز کا طول اور خطبہ کا اختصار آدمی کے تفقہ کی دلیل ہے۔

---

[1] طبقات ابن سعد، ص۱ [2] زاد المعاد جلد اول

لیکن ضرورت کے لحاظ سے آپنے طویل خطبے بھی دیئے ہیں۔ وعظ و ارشاد کے لئے عام طور پر ناغہ دے کر خطبہ دیتے تھے کہ لوگ گھبرا نہ جائیں۔ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ "نبی صلعم ہم کو گاہ بگاہ ہی وعظ سناتے تھے کہ کہیں روزانہ وعظ سننا ہم پر گراں نہ گزرے"[1] کبھی کبھی سوال کی صورت میں خطبہ شروع کرتے تھے۔ غزوہ حُنین والا خطبہ اول سے آخر تک سوال و جواب ہی کے انداز میں ہے۔

اکثر خطبہ کے وقت آپ پر والہانہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے اسکی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔ "آں حضرت صلعم کو خطبہ دیتے سُنا۔ فرما رہے تھے کہ خداوند صاحب جبروت زمین و آسمان اپنے ہاتھ میں لے لیگا۔ یہ بیان کرتے ہوئے آپ مٹھی بند کر لیتے تھے اور پھر کھول دیتے تھے......
...... جسم مبارک کبھی داہنے اور کبھی بائیں جھکتا جاتا تھا یہاں تک کہ میں نے منبر کو دیکھا تو وہ اس قدر ہل رہا تھا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں آپ کو لے کر گر تو نہیں پڑے گا"[2]

خطبوں میں سادگی کے ساتھ تاثیر بھی بہت ہوتی تھی۔ مکہ میں ایک بار آپ نے سورہ والنجم کی آیتیں تلاوت کر کے سنائیں تو یہ اثر ہوا کہ مسلمان تو مسلمان بہت سے کفار بھی سجدے میں گر پڑے"[3]

ایک دفعہ ایک نو مسلم قبیلہ ہجرت کر کے مدینہ آیا۔ اسکو امداد کی ضرورت تھی۔ آپنے مسلمانوں کو مسجد نبوی میں جمع کر کے خطبہ دیا۔ پہلے چند آیات قرآنی

---

[1] صحیحین [2] ابن ماجہ (ماخوذ از سیرۃ النبی، جلد ۲) [3] صحیح بخاری، سورہ والنجم

تلاوت فرمائیں، پھر کہا "درہم، کپڑا، غلہ، بلکہ چھوہارہ کا ایک ٹکڑا، جو بھی ہو راہ خدا میں دو۔" مدینہ میں مسلمانوں کی مالی حالت جیسی ابتر تھی وہ تھی ہی۔ لیکن آپ کی تقریر کا ایسا اثر پڑا کہ ہر صحابی نے جو کچھ اسکے پاس تھا سامنے رکھ دیا، اور بعض نے تو کپڑے تک اُتار دیئے۔[۵]

فتح مکہ پر جب آپ نے انصار کی توقع کے خلاف رؤسائے قریش کی جاں بخشی فرمادی تو ان میں سے وہ جو خُلق محمدیؐ سے پوری طرح آگاہ نہ تھے، معترض ہوئے کہ آخر آپ کو وطن اور خون کی محبت آ ہی گئی۔ آپ کو اطلاع ہوئی تو انصار سے تصدیق کی اور انکے اقرار کرنے پر آپ نے فرمایا۔ "وطن اور خاندان کی پاسداری میرے پیش نظر نہ تھی۔ میں خدا کا بندہ اور اس کا فرستادہ ہوں۔ میں نے اللہ کی طرف ہجرت کی .... اب میرا جینا تمھارا جینا ہے، اور میرا مرنا تمھارا مرنا ہے۔" انصار کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

سخت سے سخت اشتعال کے موقع پر آپ کے چند جملے معاملہ کو رفع دفع کر دیتے تھے۔ اور سالہا سال کی عداوتیں دم کے دم میں ختم ہو جاتی تھیں۔ غزوہ مصطلق سے واپسی میں ایک موقع پر منافقوں نے فتنہ برپا کیا اور معاملہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ معلوم ہوتا تھا کہ مہاجر و انصار آپس میں گتھ جائیں گے۔ آپ کو خبر پہنچی تو تشریف لائے اور اس طرح تقریر کی کہ دونوں پھر ایک ہوگئے۔

ایک بار اوس اور خزرج میں اتنی کشیدگی بڑھی کہ لوگوں نے سمجھا کہ

---

[۵] صحیح مسلم، باب الصدقات

خاص مسجد نبوی ہی میں تلواریں چمکنے لگیں گی۔ آپ کی تقریر سے ان میں پھر برادرانہ محبت کی موجیں جاری ہو گئیں۔

اب آنحضرت صلعم کے چند خطبوں کے ترجمے ملاحظہ کیجیے۔

۲

یہ خطبہ مدینہ منورہ میں ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱ھ کو بنو سالم میں دیا گیا تھا۔

"حمد و ستائش خدا کے لئے ہے۔ میں اسکی حمد کرتا ہوں (اور) مدد، بخشش اور ہدایت اسی سے چاہتا ہوں۔ میرا ایمان اسی پر ہے اور میں اسکی نافرمانی نہیں کرتا۔ (اسکی) نافرمانی کرنے والوں سے میں عداوت رکھتا ہوں۔ میری شہادت یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ یکتا ہے۔ لاشریک ہو۔ محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے۔ اسی نے محمدؐ کو ہدایت نور اور نصیحت کے ساتھ ایسے زمانے میں بھیجا ہے کہ مدتوں سے کوئی رسول دنیا میں نہ آیا تھا۔ علم گھٹ گیا تھا اور گمراہی بڑھ گئی تھی۔ وہ آخری زمانے میں قیامت کے قریب اور موت کی نزدیکی کے وقت بھیجا گیا ہے۔

"جو شخص خدا اور رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ کامیاب ہے اور جس نے انکا حکم نہ مانا وہ بھٹک گیا، درجہ سے گر گیا، اور بڑی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

"مسلمانو! میں تمہیں اللہ سے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں۔ بہترین وصیت جو مسلمان مسلمان کو کر سکتا ہے یہ ہے کہ اُسے آخرت کے لئے آمادہ کرے اور اللہ سے تقویٰ کے لئے کہے۔

"لوگو! جن باتوں سے خدا نے تم کو پرہیز کرنے کے لئے کہا ہے اُن سے بچو۔

اس سے بڑھ کر نہ کوئی نصیحت ہے اور نہ اس سے بڑھ کر کوئی ذکر۔

"یاد رکھو۔ اُمورِ آخرت کے بارہ میں جو ڈر کر کام کر رہا ہے، تقویٰ اس کا بہترین مددگار ثابت ہوگا، اور جو شخص خدا سے اپنا ظاہری اور باطنی معاملہ درست کر لے گا اور اسکی نیت خالص ہوگی، تو ایسا کرنا اسکے لئے دنیا میں نیکنامی کا اور موت کے بعد کا، جب انسان کو اعمال کی قدر و قیمت معلوم ہوگی، سرمایہ بن جائے گا۔

"اور جو شخص ایسا نہیں کرے گا وہ (قیامت میں) چاہے گا کہ اس کے اعمال اس سے دور ہی رکھے جائیں۔ خدا تم کو اپنے سے ڈراتا ہے اور خدا تو اپنے بندوں پر بہت ہی مہربان ہے۔

"جس نے اللہ کے حکم کو سچ جانا اور اسکے وعدوں کو پورا کیا تو اسکی بابت یہ ارشادِ الٰہی موجود ہے کہ "ہمارے وہاں بات نہیں بدلتی اور ہم اپنے ناچیز بندوں پر ظلم نہیں کرتے۔"

"حال اور مستقبل میں اپنے تمام ظاہر اور خفیہ کاموں میں اللہ سے تقویٰ کو پیشِ نظر رکھو۔ کیونکہ تقویٰ والوں کی بدیاں چھوڑ دی جاتی ہیں اور انکا اجر بڑھا دیا جاتا ہے۔

"تقویٰ والے وہ ہیں جو بہت بڑی مُراد کو پہنچیں گے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو اللہ کی بیزاری اور عذاب اور غصہ کو دُور کر دیتا ہے۔

"یہ تقویٰ ہی ہے جو چہرہ کو نورانی، پروردگار کو راضی اور رُتبہ کو بلند بنا دیتا ہے۔

"مسلمانو! خطا اٹھاؤ مگر حقوقِ الٰہی میں فروگذاشت نہ کرتے ہوئے۔ خدا نے اسی لیئے تم کو اپنی کتاب سکھائی ہے اور بشارت دی ہے کہ راست بازوں اور کاذبوں کو الگ الگ کر دیا جائے۔

"لوگو! خدا نے تمھارے ساتھ اچھا برتاؤ کیا ہے۔ تم بھی لوگوں کے ساتھ ایسا ہی کرو۔ اور جو خدا کے دشمن ہیں انکو دشمن سمجھو اور اللہ کے راستہ میں پوری ہمت اور توجہ سے کوشش کرو۔ اس نے تم کو برگزیدہ کیا اور تمھارا نام مسلمان رکھا کہ ہلاک ہونیوالا بھی روشن دلائل پر ہلاک ہو اور زندگی پانیوالا بھی روشن دلائل پر زندگی پائے اور یہ سب اللہ کی مدد سے ہے۔

"لوگو! اللہ کا ذکر کرو اور آنے والی زندگی کے لیئے عمل کرو۔ جو شخص اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ درست کر لیتا ہے اللہ اسکا معاملہ انسانوں کے ساتھ درست کر دیتا ہے۔ خدا بندوں پر حکم چلاتا ہے اور اس پر کسی کا حکم نہیں چلتا۔ خدا بندوں کا مالک ہے اور بندوں کا اس پر کچھ اختیار نہیں ہے۔ خدا سب سے بڑا ہے اور ہم کو (نیکی کرنے کی) طاقت اسی عظمت والے سے ملتی ہے۔"

۳

بمقام تبوک، ماہ رجب سنہ ۹ ھ

"سچائی میں ہر کلام سے بڑھ کر اللہ کی کتاب ہے، اور سب سے بڑھ کر بھروسہ کی بات تقویٰ کا کلمہ ہے اور سب ملتوں میں بڑھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہے اور سب طریقوں میں بڑھ کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طریقہ ہے۔

"سب باتوں پر اللہ کے ذکر کو شرف حاصل ہے، سب واقعات سے پاکیزہ تر یہ قرآن ہے اور بہترین کام اولوالعزمی کے کام ہیں اور امور میں بدترین

امر وہ ہے جو نیا نکالا گیا ہو۔

"انبیا کی رَوش سب رَوشوں سے اچھی ہے اور شہید کی موت تمام موتوں میں بہتر ہے، سب سے بڑا اندھاپن وہ گمراہی ہے جو ہدایت پانے کے بعد ہو جائے، اور عملوں میں وہ عمل سب سے اچھا ہے جو نفع بخش ہو اور بہترین رَوش وہ ہے جس پر لوگ چل سکیں۔ بدترین کوری دل کی کوری ہے۔ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ (یعنی دینا لینے سے اچھا ہے) تھوڑا اور ضرورت بھر کا مال اُس افراط سے اچھا ہے جو غفلت میں ڈال دے۔"

"بدترین معذرت وہ ہے جو جاں کنی کے وقت کی جائے، اور بدترین ندامت وہ ہے جو قیامت کو ہو گی۔"

"بعض لوگ جمعہ کو آتے ہیں مگر اُن کے دل کہیں اور لگے ہوتے ہیں، اور بعض ایسے آتے ہیں جو بس کبھی کبھی اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔"

"سب گناہوں میں عظیم تر جھوٹی بات ہے، اور سب سے بڑی تونگری دل کی تونگری ہے اور سب سے بڑا توشہ تقویٰ ہے اور دانائی کا راز یہ ہے کہ خدا کا خوف دل میں ہو اور اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے بہترین چیز یقین ہے اور شک کفر (کی شاخ) ہے۔

"بین۔ سے رونا جاہلیت کی بات ہے اور چوری کرنا عذاب جہنم کا سامان ہے اور بدمست ہونا آگ میں کودنا ہے اور شعر ابلیس کا حصہ ہے اور شراب تمام گناہوں کا مجموعہ ہے اور بدترین روزی یتیم کا مال کھانا ہے اور سعادت مند وہ ہے جو دوسروں سے نصیحت حاصل کرے۔ درحقیقت بدبخت وہ ہے جو

ماں کے پیٹ ہی میں بدبخت ہو جائے۔"

"عمل کا سرمایہ اسکا بہترین انجام ہے۔ بدترین خواب وہ ہے جو جھوٹا ہو۔ جو بات ہونے والی ہے (یعنی قیامت) وہ بہت قریب ہے۔"

"مومن کو گالی دینا فسق ہے اور مومن کو قتل کرنا کفر ہے اور مومن کا گوشت کھانا (یعنی اسکی غیبت کرنا) اللہ کی معصیت ہے، اور مومن کا مال دوسروں پر ایسا ہی حرام ہے جیسا کہ اسکا خون۔"

"جو خدا سے استغنا کرتا ہے خدا اسکو جھٹلاتا ہے اور جو دوسروں کے عیوب چھپاتا ہے خدا اسکے عیوب پر پردہ ڈالتا ہے اور جو معاف کرتا ہے اُسے معافی دی جاتی ہے اور جو غصہ پی جاتا ہے خدا اسکو اجر دیتا ہے اور جو نقصان پر صبر کرتا ہے خدا اسکو نعم البدل بخشتا ہے اور جو چغلی کو پھیلاتا ہے خدا اسکی رسوائی عام کر دیتا ہے اور جو صبر کرتا ہے خدا اُسے بڑھاتا ہے اور جو خدا کی نافرمانی کرتا ہے خدا اسے عذاب میں ڈالتا ہے۔"

۴

آپ کے کمسن فرزند حضرت ابراہیم کے انتقال کے دن سورج میں گہن لگنے پر جب لوگوں نے مزعوماتِ عرب کے مطابق یہ خیال ظاہر کیا کہ گہن اس سانحہ کے سبب سے تھا تو آپ نے یہ خطبہ دیا:۔

"حمد و ثنا کے بعد، لوگو، آفتاب و ماہتاب خدا کی دو نشانیاں ہیں، جو کسی کے مرنے سے تاریک نہیں ہوتیں۔

"جس چیز کو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اُسے یہیں دیکھ لیا حتیٰ کہ جنت و دوزخ

کو بھی، اور ہاں، مجھے وحی کی گئی ہے کہ تم قبروں میں آزمائے جاؤ گے، جس طرح کہ دجال سے آزمائے جاؤ گے۔ تم میں سے ہر ایک کے پاس ایک آنے والا آئے گا اور پوچھے گا کہ اس شخص (یعنی خود آں حضرت صلعم) کی نسبت تم کیا جانتے ہو۔ یقین والے کہیں گے کہ یہ محمدؐ ہیں، خدا کے رسول ہیں، جو خدا کی نشانیاں اور ہدایتیں لے کر آئے۔ ہم نے ان کو قبول کیا اور انکی پیروی کی۔ اور شک کرنے والے کہیں گے کہ ہم نہیں جانتے، جو لوگوں کو کہتے سُنا وہ ہم نے بھی کہہ دیا۔

"میرے سامنے وہ تمام مقامات پیش ہوئے جن میں تم داخل ہو گے تا آنکہ اگر میں چاہتا تو اس کا پھل توڑ لیتا، لیکن میرے ہاتھ رُک گئے۔ اور دوزخ میرے سامنے لائی گئی، میں نے اس میں ایک عورت کو دیکھا جس کو صرف اس لئے سزا دی جا رہی تھی کہ اُس نے ایک بلّی کو باندھ رکھا تھا۔ نہ اُس کو خود کچھ کھانے کو دیتی تھی نہ چھوڑتی تھی کہ زمین کی گری پڑی کوئی چیز کھائے۔ میں نے دوزخ میں ابوثمامہ، عمرو ابن مالک کو دیکھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ آفتاب و ماہتاب میں کسی بڑے آدمی کی موت سے گہن لگتا ہے، حالانکہ وہ تو خدا کی نشانیاں ہیں۔ جب تم گہن دیکھو تو نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ تا آنکہ وہ صاف ہو جائے۔"

۵

خطبۂ حجۃ الوداع:-

"لوگو! میں خیال کرتا ہوں کہ میں اور تم پھر کبھی اس مجلس میں اکٹھا نہ ہوں گے۔

"لوگو! تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری آبرو ایک دوسرے پر ویسے ہی حرام ہیں جیسے کہ تم آج کے دن کی، اس مہینہ کی اور اس شہر کی حرمت کرتے ہو۔

"لوگو! تمھیں عنقریب خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے، اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بابت سوال فرمائے گا۔ خبردار میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔"

"لوگو! جاہلیت کی ہر ایک بات کو میں اپنے قدموں کے نیچے پامال کرتا ہوں۔ جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقام خون) باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا خون 'ربیعۃ بن الحارث' کا خون باطل کرتا ہوں۔ جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے گئے۔ اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا سود، عباسؓ بن عبدالمطلب کا سود، باطل کرتا ہوں۔"

"لوگو! اپنی بیویوں کے متعلق اللہ سے ڈرتے رہو، خدا کے نام کی ذمہ داری سے تم نے ان کو بیوی بنایا ہے اور خدا کے کلام سے تم نے ان کا جسم اپنے لیے حلال کیا ہو۔ تمہارا حق تمہاری عورتوں پر اتنا ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی غیر کو نہ آنے دیں، لیکن اگر وہ ایسا کریں تو ان کو ایسی مار مارو کہ تکلیف دہ نہ ہو۔ عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کو اچھا کھلاؤ، اچھا پہناؤ۔

"لوگو! میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر اسے مضبوط پکڑ لو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ وہ چیز قرآن، اللہ کی کتاب ہے۔

"لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی اور پیغمبر ہے اور نہ کوئی نئی اُمت ہی پیدا ہونے والی ہے۔ خوب سن لو، اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور نماز پنجگانہ ادا کرو۔

سال بھر میں ایک مہینہ رمضان کے روزے رکھو۔ اپنے زر و مال کی زکوٰۃ نہایت خوشی کے ساتھ دیا کرو۔ خانۂ کعبہ کا حج بجالاؤ اور اپنے اولیائے امور و حکام کی اطاعت کیا کرو۔ اس کی جزا یہ ہے کہ تم اللہ کی فردوس بریں میں داخل ہو گے۔

"لوگو! قیامت میں تم سے میری بابت بھی دریافت کیا جائے گا۔ ذرا مجھے بتاؤ کہ کیا جواب دو گے۔

(سب نے کہا کہ "ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کے احکام ہم تک پہونچا دیئے۔ آپ نے رسالت کا حق ادا کر دیا۔ آپ نے کھرے اور کھوٹے کا فرق اچھی طرح ظاہر کر دیا۔" یہ سُن کر آپ نے کلمہ کی اُنگلی آسمان کی طرف اُٹھائی اور فرمایا۔ "اے اللہ! تو گواہ رہ۔")

"دیکھو وہ جو موجود ہیں اُن کو جو موجود نہیں ہیں۔ یہ باتیں پہونچاتے رہیں۔ ممکن ہے کہ موجود ہونے والوں کے مقابلہ میں موجود نہ ہونے والے اس کلام کو زیادہ یاد رکھنے والے اور اسکی زیادہ حفاظت کرنے والے ثابت ہوں۔"

۶

اور آخر میں حضور سرورِ کائنات کا آخری خطبہ:۔

"لوگو! مرحبا! خدا کی نصرت، سلامتی اور حفاظت تمھارے ساتھ ہو، خدا تمھیں رفعت، ہدایت اور توفیق عطا فرمائے، خدا تمھیں اپنی پناہ میں رکھے۔ آفات سے بچائے اور سلامت رکھے۔

"میں تم کو تقویٰ اور خدا ترسی کی وصیت کرتا ہوں اور تم کو عذاب الٰہی سے ڈراتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم بھی لوگوں کو اس سے ڈراتے رہو گے۔

"تم کو لازم ہے کہ سرکشی، تکبّر اور اینٹھ کر چلنے کو خدا کے بندوں میں اور خدا کی بستیوں میں نہ پھیلنے دو۔ آخرت کا گھر انہی کے لیے ہے جو دُنیا میں اینٹھ کر نہیں چلتے اور فساد نہیں پیدا کرتے۔

"اچھی عاقبت صرف متّقی لوگوں کی ہے۔ میں اُن فتوحات کو دیکھ رہا ہوں جو تم کو حاصل ہوں گی۔ مجھے یہ خوف تو نہیں ہے کہ تم شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے، لیکن اندیشہ یہ ہے کہ دُنیا کی رغبت اور فتنہ میں پڑ کر کہیں ہلاک نہ ہو جاؤ، جس طرح تم سے پہلے اُمّتیں ہلاک ہوئیں۔"

ضمیمہ (۲)

حدیثیں

وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ

(بے شک تم سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتے ہو۔ سیدھا راستہ اللہ کا ہے۔" القرآن، شوریٰ)

جو ہدایتِ ربّانی رسولِ مقبول محمد صلّی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے دنیا کو پہونچی اس کے دو حصّہ ہیں۔ ایک قرآن مجید اور دوسرے حدیث و سُنّت۔ حدیث آپ کی ان تمام قولی اور سنّت اُن تمام عملی ہدایات و تعلیمات کو کہتے ہیں جو آپ اللہ کے نبی اور اس کی کتاب کے شارح کی حیثیت سے اُمّت کو دیتے تھے۔

ذیل میں ہم آپ کی چند احادیث یعنی اقوال و ارشادات پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں ہم کو اُس اسلامی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں جو آپ کی ذاتِ اقدس میں پوری طرح جلوہ گر تھی اور طالبانِ ہدایت اُن سے آج بھی وہ روشنی حاصل کر سکتے ہیں جو آپکے دور میں آپ پر ایمان لانے والے آپ کی مؤثر ہستی سے حاصل کیا کرتے تھے۔

۲

(۱) لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی شہادت دینا جنّت کی کنجی ہے۔

(۲) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو خواہ تم کو مار ڈالا جائے یا جلا دیا جائے۔

(۳) آدمی کو اسکی نیت ہی کے مطابق اس کے عمل کا پھل ملتا ہے۔

(۴) جب تم کو اپنے اچھے عمل سے مسرت ہو اور بُرے کام سے رنج و قلق ہو تو تم مومن ہو۔

(۵) جب تم سے کوئی بُرا کام ہو جائے تو فوراً نادم ہو اور سچّے دل سے توبہ کر کے نیکی میں لگ جاؤ۔

(۶) احسان اس کا نام ہے کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگرچہ تم اسکو نہیں دیکھ سکتے وہ تو تم کو دیکھتا ہے۔

(۷) خدا تمھاری صورتوں اور تمھارے مالوں کو نہیں دیکھتا۔ وہ تمھارے دلوں اور تمھارے عملوں کو دیکھتا ہے۔

(۸) انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا۔ وہ ٹکڑا دل ہے۔

(۹) پرہیزگاری عمل کی سرداری ہے۔

(۱۰) تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اسکی خواہشاتِ نفس میری لائی ہوئی ہدایت کی تابع نہ ہو جائیں۔

(۱۱) دُعا خلاصۂ عبادت ہے۔

(۱۲) نماز دین کا ستون ہے۔

(۱۳) جس کی نماز اس کو بدی اور بُرائی سے نہ روکے وہ اُسے خدا سے دور کر دیتی ہے۔

(۱۴) روزہ رکھ کر جو شخص جھوٹ اور فریب کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ کھانا پینا چھوڑ دے۔

(۱۵) کسی بندہ کو صبر سے زیادہ وسیع کوئی چیز عطا نہیں ہوئی

(۱۶) ہر دین کا کوئی امتیازی وصف ہوتا ہے اور اسلام کا امتیازی وصف حیا ہے۔

(۱۷) جھوٹ سے ہمیشہ بچتے رہو، کیونکہ جھوٹ بولنے کی عادت آدمی کو بدکاری کے راستہ پر ڈال دیتی ہے۔

(۱۸) یہ بھی بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی جھوٹی بات بیان کرو درانحالیکہ وہ تم کو اس بیان میں سچا سمجھتا ہو۔

(۱۹) جس میں امانت کی خصلت نہیں اس میں ایمان نہیں جس میں عہد کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں۔

(۲۰) میں حُسنِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

(۲۱) اچھے خُلق ہی کو اسلام کہتے ہیں۔

(۲۲) تم میں سب سے اچھا آدمی وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

(۲۳) انسان حُسنِ اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر نماز پڑھنے سے ملتا ہے۔

(۲۴) تمھارے مال لوگوں کو کفایت نہیں کر سکتے، ہاں تمھارے اخلاق کفایت

کر سکتے ہیں۔

(۲۵) لوگوں کے لیے اپنے اخلاق کو بہتر بناؤ۔

(۲۶) ہر نیکی اور احسان صدقہ ہے۔

(۲۷) جو شخص نرمی کی صفت سے محروم کیا گیا وہ سارے خیر سے محروم کیا گیا۔

(۲۸) اللہ خود مہربان ہے اور نرمی اور مہربانی اُسے محبوب بھی ہے۔

(۲۹) مومن تو الفت و محبت کا مرکز ہے۔ اُس شخص میں کوئی بھلائی نہیں جو دوسروں سے الفت نہیں کرتا اور دوسرے اُس سے اُلفت نہیں کرتے۔

(۳۰) جس بندہ نے بھی اللہ کے لیے کسی بندہ سے محبت کی اس نے اپنے رب عز و جل ہی کی عظمت و توقیر کی۔

(۳۱) اچھی اور میٹھی بات بھی ایک صدقہ ہے۔

(۳۲) زمین پر بسنے والی اللہ کی مخلوق پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحمت کریگا

(۳۳) نہیں نکالا جاتا رحمت کا مادہ مگر بدبخت کے دل سے۔

(۳۴) سخت گو اور درشت خو آدمی جنت میں نہ جائے گا۔

(۳۵) غصّہ ایمان کو خراب کرتا ہے جیسے کہ ایلوا شہد کو خراب کرتا ہے۔

(۳۶) مومن لعن طعن کرنے والا نہیں ہوتا اور نہ فحش گو اور بدکلام ہوتا ہے۔

(۳۷) جو شخص کسی ظالم کی مدد کے لیے اور اس کا ساتھ دینے کے لیے چلا اور اس کو اس بات کا علم تھا کہ یہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے نکل گیا۔

(۳۸) وہ مومن نہیں جس کے پڑوسی اس کی شرارتوں اور آفتوں کی وجہ سے خائف رہتے ہوں۔

(۳۹) اصلاح ذات البین کا درجہ نماز، روزہ وغیرہ عبادات سے زیادہ ہے۔

(۴۰) تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔

(۴۱) مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جس کی طرف سے لوگوں کو اپنی جانوں اور مالوں کے بارہ میں کوئی خطرہ نہ ہو۔

(۴۲) تم دوسروں کے متعلق بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔

(۴۳) تم کسی کی کمزوریوں کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور جاسوسوں کی طرح کسی کے عیوب معلوم کرنے کی کوشش نہ کیا کرو۔

(۴۴) حسد آدمی کی نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح کہ آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

(۴۵) تم اپنے کسی بھائی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار مت کرو۔ (اگر ایسا کروگے تو ہو سکتا ہے کہ) اللہ اسکو اس مصیبت سے نجات دیدے اور تمکو مبتلا کردے۔

(۴۶) حرص و بخل اور ایمان کبھی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

(۴۷) انسان کو سب سے زیادہ کڑھا دینے والی بات حرص ہے اور سب سے زیادہ گھبرا دینے والی بات بزدلی۔

(۴۸) اللہ فرماتا ہے کہ "تم دوسروں پر خرچ کرتے رہو، میں تم پر خرچ کرتا رہونگا"۔

(۴۹) کسی بندہ کا مال صدقہ کی وجہ سے کم نہیں ہوتا۔

(۵۰) وہ شخص مومن نہیں جو خود شکم سیر ہو کر کھائے اور اس کا پڑوسی فاقہ سے رہے۔

(۵۱) اصلی دولتمندی دل کے اندر ہوتی ہے اور اصلی فقیری اور محتاجی بھی دل ہی کے اندر ہوتی ہے۔

(۵۲) جو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے اپنے کو بچانا چاہتا ہے تو اللہ اسکی مدد فرماتا ہے اور اسے سوال کی ذلت سے بچا دیتا ہے اور جو بندوں کا محتاج اور نیاز مند بننا نہیں چاہتا اللہ تعالےٰ اُسے بندوں سے بے نیاز بنا دیتا ہے۔

(۵۳) جو شخص سوال کا دروازہ کھولتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر فقر و محتاجی کا دروازہ کھولدیتا ہے۔

(۵۴) جو بندہ کسی جانی یا مالی مصیبت میں مبتلا ہو اور نہ کسی سے اسکا اظہار نہ کرے اور نہ لوگوں سے شکوہ شکایت کرے تو اللہ تعالیٰ کے ذمّہ ہے کہ وہ اُسے بخشدینگے۔

(۵۵) جس نے اپنے محسنوں کا شکر نہ ادا کیا اس نے اللہ کا شکر بھی نہیں ادا کیا۔

(۵۶) آدمی کے اسلام کی خوبی اور اسکے کمال میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ فضول اور غیر مفید کاموں اور باتوں کا تارک ہو۔

(۵۷) آدمیوں کو جہنم میں اوندھے منہ انکی بکواس ہی ڈالے گی۔

(۵۸) بُرے ساتھی کی ہمنشینی سے اکیلے رہنا بہتر ہے اور اچھے ساتھی کیساتھ بیٹھنا تنہائی سے بہتر ہے اور کسی کو اچھی باتیں بتانا خاموش رہنے سے بہتر ہے

اور بری باتیں بتانے سے خاموش رہنا بہتر ہے۔

(۵۹) چغل خور آدمی جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔

(۶۰) دنیا میں جو شخص دو رخا ہو گا، قیامت کے دن اسکے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہونگی۔

(۶۱) وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو گا۔

(۶۲) میانہ روی ایک اچھا عمل ہے۔

(۶۳) ہر امت کے لئے کوئی خاص آزمائش ہوتی ہے اور میری اُمّت کی خاص آزمائش مال ہے۔

(۶۴) دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم کوئی پردیسی یا مسافر ہو۔

(۶۵) اپنے درمیان سلام کا رواج پھیلاؤ اور اسے عام کرو۔

(۶۶) نیکیوں میں ایک بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے والدین کے انتقال کے بعد بھی انکے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

(۶۷) دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

(۶۸) دولت ایک خوشگوار چیز ہے، تو جو اسے صحیح طور پر خرچ کرے اس کے لئے بہترین مددگار ہے اور جو اُسے صحیح طور پر خرچ نہیں کرتا اسکی مثال ایسی ہے کہ کھاتا جائے اور سیر نہ ہو۔

(۶۹) چار عادتیں ایسی ہیں کہ جس میں وہ چاروں جمع ہو جائیں وہ خالص منافق ہے۔ اور جس میں ان چاروں میں سے کوئی ایک خصلت ہو تو اس کا حال

یہ ہے کہ اس میں منافق کی ایک خصلت ہے اور وہ اسی حالت میں رہے گا جبتک کہ وہ عادت چھوڑ نہ دے۔ وہ چاروں عادتیں یہ ہیں۔ جب اسکو کسی امانت کا امین بنایا جائے تو اس میں خیانت کرے، جب بولے تو جھوٹ بولے، جب عہد و معاہدہ کرے تو اسکے خلاف کرے، اور جب کسی سے جھگڑا یا اختلاف کرے تو بدزبانی کرے۔

(۷۰) جو کوئی تم میں سے کوئی بُری یا خلافِ شرع بات دیکھے تو لازم ہے کہ اگر طاقت رکھتا ہو تو اپنے ہاتھ سے (یعنی زور و قوت سے) اسکو بدلنے کی (یعنی درست کرنے کی) کوشش کرے، اور اگر اسکی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر اپنی زبان ہی سے اسکو بدلنے کی کوشش کرے، اور اگر اسکی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل ہی سے اسکو بُرا سمجھے؛ اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔

ضمیمہ (۳)

دُعَائیں

رَبِّ اِنِّی اَعُوْذُ بِکَ اَنْ اَسْئَلَکَ مَا لَیْسَ لِی بِہٖ عِلْمٌ

(خداوندا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تجھ سے کوئی جاہلانہ سوال کروں۔)

دعا کو ایک حدیث میں عبادت کا مغز بتایا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ہم اسکو صاحبِ دُعا کے نفس کا نچوڑ بھی کہہ سکتے ہیں جب کوئی شخص اپنے حقیقی آقا و مولا کے حضور میں اپنی کوئی التجا پیش کرتا ہے تو اس وقت اسکی شخصیت پر سے سارے پردے اٹھ جاتے ہیں اور اسکے دل کے چھپے ہوئے احساسات بلا کسی ملاوٹ کے الفاظ کے سانچوں میں ڈھل کر اسکی زبان پر آجاتے ہیں۔ ان الفاظ سے جو اس وقت اسکی زبان سے ادا ہوتے ہیں ہم اسکے ایمان و اخلاق اور اسکی معاشرت اور طرزِ زندگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کی زندگی میں چونکہ دعا کو ایک

بڑی ہی ممتاز جگہ حاصل تھی اور اللہ پاک سے اپنی ہر حاجت کا سوال گویا کہ آپکی فطرت بن گیا تھا اس لئے ... ... آپ کی سیرت کے مطالعہ میں آپ کی دعائیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی غرض سے ہم اس کتاب کا خاتمہ آپ کی دعاؤں کے ذیل کے مختصر سے مجموعہ پر کر رہے ہیں۔

حدیث شریف کی دعاؤں کا مطالعہ کرتے وقت نبی صلعم کی روحانیت اور تعلق باللہ، خلوص اور شوق دعا اور آپ کی انسانیت دوستی اور دردمندی کے علاوہ جو چیز ہم کو متاثر کرتی ہے وہ انسانی زندگی اور اسکی ضروریات سے آپ کی واقفیت ہے جس نے ان دعاؤں میں دین و دنیا کی ایک انوکھی جامعیت پیدا کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکے آئینہ میں بارہا ہم کو خود اپنی تصویر نظر آتی رہتی ہے اور ہم جس حال میں بھی ہوں یہ ہماری تسکین کا باعث بنجاتی ہیں۔

ایک اور فائدہ ان دعاؤں میں یہ بھی ہے کہ جس سوز و گداز اور ضمیر انسانی کے جن احساسات کی یہ ترجمان ہیں انکو اپنے اندر پیدا کرنے کا یہ ایک آسان اور نہایت مؤثر ذریعہ ہیں۔ جو لوگ سچے دل سے انکو اپنا ورد و معمول بنالیں گے وہ انشاء اللہ دیکھیں گے کہ کسی نہ کسی درجہ میں یہ دولت ان کو ضرور حاصل ہو جائیگی۔

۲

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کُلُّہٗ	اے اللہ! ساری حمد و ثنا صرف تیرے ہی
وَلَکَ الشُّکْرُ کُلُّہٗ، وَلَکَ	لئے ہے اور شکر سب کا صرف تیرے ہی
الْمُلْکُ کُلُّہٗ، وَلَکَ الْخَلْقُ	لئے ہے، اور ملک سارے کا سارا صرف
کُلُّہٗ بِیَدِکَ الْخَیْرُ کُلُّہٗ	تیرا ہی ہے اور خلقت سب کی سب صرف

وَإِلَيْكَ يَرْجِعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ
أَسْأَلُكَ الْخَيْرَ كُلَّهُ وَأَعُوذُ بِكَ
مِنَ الشَّرِّ كُلِّهِ

تیری ہی ہے۔ ساری بھلائیاں بس
تیرے ہی ہاتھ میں ہیں اور ہر چیز کا
مرجع تو ہی ہے۔ اے اللہ! ساری
بھلائیوں اور اچھائیوں کا میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور ساری برائیوں کی تجھ سے
پناہ مانگتا ہوں۔

(۲) اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ
وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ،
اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْ كُلَّ مُهِمٍّ مِنْ
حَيْثُ شِئْتَ وَمِنْ اَيْنَ شِئْتَ
حَسْبِيَ اللّٰهُ لِدِيْنِيْ حَسْبِيَ اللّٰهُ
لِدُنْيَايَ ، حَسْبِيَ اللّٰهُ لِمَا اَهَمَّنِيْ
حَسْبِيَ اللّٰهُ لِمَنْ بَغٰى عَلَيَّ ،
حَسْبِيَ اللّٰهُ لِمَنْ حَسَدَنِيْ
حَسْبِيَ اللّٰهُ لِمَنْ كَادَنِيْ بِسُوْءٍ
حَسْبِيَ اللّٰهُ عِنْدَ الْمَوْتِ ،
حَسْبِيَ اللّٰهُ عِنْدَ الْمَسْأَلَةِ فِي الْقَبْرِ
حَسْبِيَ اللّٰهُ عِنْدَ الْمِيْزَانِ
حَسْبِيَ اللّٰهُ عِنْدَ الصِّرَاطِ
حَسْبِيَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ

اے ساتوں آسمانوں کے پروردگار اور
اے عرشِ عظیم کے مالک! اے میرے اللہ!
میری ہر مہم اور حالت کے لیے تو ہی کافی
ہو جا۔ جس طرح کہ تو چاہے اور جہاں
سے تو چاہے۔ میرے دین کے لیے میرا اللہ
کافی، میری دنیا کے لیے میرا اللہ کافی،
میری سب فکروں کے لئے میرا اللہ کافی،
جو کوئی مجھ پر زیادتی کرے اس سے مجھے
میرا اللہ کافی، جو کوئی مجھ سے حسد کرے
اس سے مجھے میرا اللہ کافی، جو میرے
ساتھ کوئی برا داؤں چلے مجھے اس سے
میرا اللہ کافی، موت کے وقت مجھے
میرا اللہ کافی، قبر کے سوال کے وقت
مجھے میرا اللہ کافی، وزنِ اعمال کے وقت

توکّلتُ وھو ربُّ العرشِ العظیم۔

مجھے میرا اللہ کافی، صراط سے گذرنے کے وقت مجھے میرا اللہ کافی، بس مجھے میرا اللہ کافی ہے۔ اسکے سوا کوئی معبود و مولا نہیں، بس اسی پر میرا بھروسہ ہو اور وہ عرش عظیم کا رب ہے۔

(۳) اللّٰھُمَّ لکَ اسلمتُ وبکَ آمنتُ وعلیکَ توکّلتُ والیکَ انبتُ وبکَ خاصمتُ والیکَ حاکمتُ فاغفرلی ما قدّمتُ وما اخّرتُ وما اسررتُ وما اعلنتُ وما اسرفتُ وما انتَ اعلمُ بہٖ منّی انتَ المقدّمُ وانتَ المؤخّرُ لاالٰہ الّا انتَ ولاحولَ ولا قوّۃَ الّا باللّٰہ۔

اے اللہ! میں نے اپنا سر اطاعت تیرے لئے جھکا دیا، میں تجھ پر ایمان لایا میں نے تجھ پر توکّل و اعتماد کر لیا۔ میں تیری طرف رجوع ہو گیا اور میں نے تجھے فیصلہ کُن حاکم مان لیا۔ سو تو میرے اگلے پچھلے اور چُھپے کُھلے سارے گناہ معاف کر دے اور جو میں نے زیادتیاں کیں ان کو بخش دے اور اے اللہ میرے جن قصوروں سے تو مجھ سے زیادہ باخبر ہے ان کو بھی معاف کر دے۔ تو ہی آگے اور پیچھے کرنے والا ہے تیرے سوا کوئی معبود و مولا نہیں اور گناہوں سے بچنے کی قوت اور نیکیاں کرنے کی طاقت بغیر اللہ کی مدد کے کسی کو نہیں۔

(۴) اللّٰھُمَّ انّی اسئلکَ ایمانًا دائمًا واسئلکَ قلبًا خاشعًا واسئلکَ یقینًا صادقًا

اے اللہ! میں تجھ سے مانگتا ہوں ہمیشہ ساتھ رہنے والا ایمان، اور تیرے ڈر سے سہا رہنے والا دل، اور میں تجھ سے

وَاَسْئَلُكَ دِيْناً قَيِّماً
وَاَسْئَلُكَ الْعَافِيَةَ مِنْ كُلِّ
بَلِيَّةٍ وَّاَسْئَلُكَ دَوَامَ الْعَافِيَةِ
وَاَسْئَلُكَ الشُّكْرَ عَلَى الْعَافِيَةِ
وَاَسْئَلُكَ الْغِنٰى عَنِ النَّاسِ

مانگتا ہوں یقین صادق اور سچا دین اور تجھ سے مانگتا ہوں ہر بلا سے عافیت اور دوامی عافیت اور پھر اس عافیت پر شکرگذاری کی توفیق اور اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ سارے انسانوں سے تو مجھے بے نیاز رکھ۔

(۵) اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ
اَنْ اَضِلَّ اَوْ اُضَلَّ اَوْ اَزِلَّ
اَوْ اُزَلَّ اَوْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ
اَوْ اَجْهَلَ اَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ۔

خداوندا! میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ خود گمراہ ہو جاؤں یا کوئی دوسرا مجھے گمراہ کردے، یا خود لغزش کھا جاؤں یا کوئی دوسرا مجھے لغزش میں مبتلا کردے یا میں خود کسی پر ظلم کر بیٹھوں یا مجھ پر کوئی ظلم کرے یا میں نادانی کی کوئی حرکت کردوں یا میرے ساتھ کوئی نادانی کی حرکت کر گذرے۔

(۶) اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْ لِیْ دِیْنِیَ الَّذِیْ
هُوَ عِصْمَةُ اَمْرِیْ وَاَصْلِحْ
لِیْ دُنْيَایَ الَّتِیْ فِيْهَا مَعَاشِیْ
وَاَصْلِحْ لِیْ آخِرَتِیَ الَّتِیْ فِيْهَا
مَعَادِیْ وَاجْعَلِ الْحَيَاةَ زِيَادَةً
لِّیْ فِیْ كُلِّ خَيْرٍ وَّاجْعَلِ الْمَوْتَ
رَاحَةً لِّیْ مِنْ كُلِّ شَرٍّ

اے اللہ میرے لئے میرا دین بنادے جو میرا آسرا ہے اور میرے لئے میری دنیا بنادے جو میری زندگی ہے اور میرے لئے میری آخرت بنادے جس میں مجھے لوٹ کر جانا ہے اور زندگی کو میرے لیے ہر بھلائی میں ترقی کا ذریعہ بنا اور موت کو ہر برائی سے نجات کا سبب بنا۔

(۷) اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ نَعِیْمًا لَّا یَنْفَدُ وَقُرَّۃَ عَیْنٍ لَّا تَنْقَطِعُ وَاَسْئَلُکَ الرِّضَا بِالْقَضَاءِ وَبَرْدَ الْعَیْشِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔

الٰہی میں تجھ سے ایسا لطف چاہتا ہوں جو ختم نہ ہو اور یہ آنکھ کی ایسی ٹھنڈک جو زائل نہو اور تجھسے چاہتا ہوں تیرے فیصلہ پر تسلیم و رضا اور موت کے بعد پُر لطف زندگی۔

(۸) اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَۃَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ

اے اللہ میں تجھسے مانگتا ہوں بخشش اور سلامتی دنیا اور آخرت میں۔

(۹) اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْھُدٰی وَالتُّقٰی وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰی

اے اللہ میں تجھسے ہدایت، خدا ترسی پاکدامنی اور استغنا کا سوال کرتا ہوں۔

(۱۰) اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَّرِزْقًا طَیِّبًا وَّعَمَلًا مُّتَقَبَّلًا۔

اے اللہ میں تجھسے مفید علم، پاک روزی اور مقبول عمل کا سوال کرتا ہوں۔

(۱۱) اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَعَافِنِیْ وَارْزُقْنِیْ۔

اے اللہ تو مجھے بخش دے، مجھ پر رحم فرما، مجھے عافیت دے اور رزق عطا فرما۔

(۱۲) اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِیْشَۃً نَّقِیَّۃً وَّمِیْتَۃً سَوِیَّۃً۔

اے اللہ! میں تجھ سے اچھی زندگی اور اچھی موت مانگتا ہوں۔

(۱۳) اَللّٰھُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِی الْاُمُوْرِ کُلِّھَا وَاَجِرْنَا مِنْ خِزْیِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ۔

اے اللہ! ہمارا انجام اچھا کر کل کاموں میں اور ہم کو دنیا اور آخرت کی رسوائی سے بچا۔

(۱۴) اَللّٰھُمَّ اکْفِنِیْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَاَغْنِنِیْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ ۔

اے اللہ! اپنی حلال کی ہوئی چیزوں سے میری کفایت کر کے مجھے حرام سے محفوظ رکھ اور اپنے خاص فضل کے ذریعہ سے مجھے سب ماسوا سے بے نیاز کر دے۔

(۱۵) اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لَنَا اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ وَسَھِّلْ لَنَا اَبْوَابَ رِزْقِكَ۔

اے اللہ! ہمارے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے اور اپنے رزق کے راستے ہمارے لئے آسان کر دے۔

(۱۶) اَللّٰھُمَّ الْطُفْ بِیْ فِیْ تَیْسِیْرِ کُلِّ عَسِیْرٍ فَاِنَّ تَیْسِیْرَ کُلِّ عَسِیْرٍ عَلَیْكَ یَسِیْرٌ وَاَسْئَلُكَ الْیُسْرَ وَالْمُعَافَاةَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ اَللّٰھُمَّ اعْفُ عَنِّیْ فَاِنَّكَ عَفُوٌّ کَرِیْمٌ ۔

اے اللہ! ہر مشکل کو آسان کر کے مجھ پر مہربانی فرما۔ سب مشکلوں کا آسان کرنا تیرے لئے بالکل آسان ہے۔ اور اے اللہ دنیا اور آخرت میں عافیت عطا ہونے کی تجھ سے التجا ہے۔ خداوندا مجھے معاف فرما دے۔ تو بہت معاف کرنے والا، بڑا کریم ہے۔

(۱۷) یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِكَ ۔

اے دلوں کے پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر مضبوطی سے قائم کر اور قائم رکھ۔

(۱۸) اَللّٰھُمَّ اِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَاصِیَنَا وَجَوَارِحَنَا بِیَدِكَ لَمْ تُمَلِّكْنَا مِنْھَا شَیْئًا فَاِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ

اے اللہ! ہمارے دل اور ہماری پیشانیاں اور ہمارے سب اعضا تیرے ہاتھ میں ہیں۔ ہم کو ان پر کچھ اختیار نہیں ہے۔

فَكُنْ اَنْتَ وَلِيَّنَا وَاهْدِنَا اِلٰى سَوَآءِ السَّبِيْلِ

پس جبکہ تو نے یہ کیا ہے تو پھر تو ہی خود ہمارا کارساز و مددگار ہو جا اور ہم کو ٹھیک راستہ پر چلا۔

(١٩) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ اَخْشَاكَ كَاَنِّيْ اَرَاكَ اَبَدًا حَتّٰى اَلْقَاكَ وَاَسْعِدْنِيْ بِتَقْوَاكَ وَلَا تُشْقِنِيْ بِمَعْصِيَتِكَ۔

اے اللہ مجھے ایسا کر دے کہ میں تیرے حضور میں پیش ہونے تک تجھ سے ایسا ڈروں کہ گویا ہر وقت تجھے دیکھتا ہوں اور اپنا خوف و تقویٰ عطا فرما کر مجھے نیک نصیب کر اور اپنی مصیبتوں میں مبتلا کر کے میری بدنصیبی کا فیصلہ نہ فرما۔

(٢٠) اَسْئَلُكَ خَشْيَتَكَ فِي الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَكَلِمَةَ الْاِخْلَاصِ فِي الرِّضَا وَالْغَضَبِ۔

تجھ سے تیرا ڈر مانگتا ہوں حاضر میں اور غائب میں اور سچائی کی بات خوشی میں اور غصہ میں۔

(٢١) اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ عَيْنَيْنِ هَطَّالَتَيْنِ تَسْقِيَانِ الْقَلْبَ بِذُرُوْفِ الدَّمْعِ مِنْ خَشْيَتِكَ قَبْلَ اَنْ تَكُوْنَ الدُّمُوْعُ دَمًا وَالْاَضْرَاسُ جَمْرًا۔

اے اللہ مجھے ایسی اشکبار آنکھیں عطا فرما جو تیرے خوف کے آنسو بہا کے دل کو سیراب کریں، اس سخت وقت کے آنے کے پہلے جبکہ آنسو خون ہو جائینگے اور داڑھیں انگارہ بن جائینگی۔

(٢٢) اَللّٰهُمَّ اٰتِ نَفْسِيْ تَقْوٰهَا وَزَكِّهَا اَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا۔

اے اللہ میرے نفس کو پرہیزگاری عطا فرما اور اس کو پاک کر دے۔ تو ہی سب سے اچھا پاک کرنے والا ہے، تو ہی اس کا مالک اور آقا ہے۔

(۲۳) اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ اِلَيْنَا الْاِيْمَانَ وَزَيِّنْهُ فِيْ قُلُوْبِنَا وَكَرِّهْ اِلَيْنَا الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ وَاجْعَلْنَا مِنَ الرَّاشِدِيْنَ اَللّٰهُمَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُوْنِيْنَ۔

اے اللہ! ایمان کو ہمارے لئے پیارا اور محبوب بنا اور ہمارے دلوں میں اس کو آراستہ فرما۔ اور کفر و فسق اور معصیت کی طرف سے ہمارے اندر نفرت و کراہت پیدا کر دے۔ ہم کو رشد و ہدایت والوں میں سے کر دے۔ اے اللہ اسلام پر خاتمہ کر اور ہم کو اپنے صالح بندوں کے ساتھ ملا دے۔ نہ ہم رسوا ہوں نہ فتنوں میں پڑیں۔

(۲۴) اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ يُّقَرِّبُ اِلٰى حُبِّكَ۔

اے میرے اللہ مجھے اپنی محبت دے تیرے جو بندے تجھ سے محبت رکھتے ہوں ان کی محبت دے اور جو اعمال تیری محبت سے مجھے قریب کر دیں ان کی مجھے محبت دے۔

(۲۵) اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ۔

اے اللہ اپنے ذکر و شکر و اچھی عبادت پر میری مدد فرما اور مجھے اپنا ذاکر و شاکر اور اچھا عبادت گزار بندہ بنا دے۔

(۲۶) اَللّٰهُمَّ فَالِقَ الْاِصْبَاحِ وَجَاعِلَ اللَّيْلِ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا قَوِّنِیْ عَلَى الْجِهَادِ فِیْ سَبِيْلِكَ۔

اے اندھیری رات کا پردہ چاک کر کے صبح کے روشن کرنے والے مولا اور رات کو سکون و آرام کا ذریعہ بنانے والے آقا! چاند سورج کو اوقات شناسی کا آلہ مقرر کرنے والے میرے اللہ! مجھے اپنی راہ میں پوری جدوجہد کرنے کی قوت عطا فرما۔

(۲۷) اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنِيْ لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ وَالْفِعْلِ وَالنِّيَّةِ وَالْهُدٰى اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔

اے اللہ! جو باتیں اور جو اعمال افعال اور جو ارادے اور جو طریقے تجھے پسند اور محبوب ہوں اور تو جن سے راضی ہو انہی کی مجھے توفیق دے۔ بیشک سب کچھ تیرے قبضۂ قدرت میں ہے۔

(۲۸) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ سَرِيْرَتِيْ خَيْرًا مِّنْ عَلَانِيَتِيْ وَاجْعَلْ عَلَانِيَتِيْ صَالِحَةً

اے اللہ! میرا باطن میرے ظاہر سے اچھا کر دے اور میرے ظاہر کو بھی صلاحیت عطا فرما۔

(۲۹) اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنِيْ رُشْدِيْ وَقِنِيْ شَرَّ نَفْسِيْ ۔

اے اللہ! بھلائی اور سچائی کی باتیں میرے دل میں ڈال اور اپنے نفس کی شرارتوں سے مجھے محفوظ رکھ۔

(۳۰) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ الَّذِيْنَ اِذَا اَحْسَنُوْا اسْتَبْشَرُوْا وَاِذَا اَسَاءُوْا اسْتَغْفَرُوْا ۔

خداوندا! مجھے اپنے ان بندوں میں سے کر دے جو نیکی کرتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور اگر ان سے کوئی برائی ہو جاتی ہے تو توبہ و استغفار کر کے اس کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔

(۳۱) اَللّٰهُمَّ غَشِّنِيْ بِرَحْمَتِكَ وَجَنِّبْنِيْ عَذَابَكَ ۔

اے اللہ! مجھے اپنی رحمت سے ڈھانک لے اور اپنے عذاب سے بچا دے۔

(۳۲) اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْ قَدَمِيْ يَوْمَ تَزِلُّ فِيْهِ الْاَقْدَامُ ۔

اے اللہ! جس دن لوگوں کے قدم ڈگمگانے لگیں اس دن تو مجھے ثابت قدم رکھ۔

(۳۳) اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَسِيْرًا ۔

اے اللہ قیامت کے دن میرا حساب آسانی سے ہو۔

(۳۴) اَللّٰهُمَّ اَحْسَنْتَ خَلْقِيْ فَاَحْسِنْ خُلُقِيْ۔
اے اللہ تو نے میری صورت اچھی بنائی تو میرے اخلاق بھی اچھے کر۔

(۳۵) اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ صِحَّةً فِيْ اِيْمَانٍ وَّاِيْمَانًا فِيْ حُسْنِ خُلُقٍ۔
اے اللہ میں تجھ سے تندرستی ایمان کے ساتھ اور ایمان حسن اخلاق کیساتھ مانگتا ہوں۔

(۳۶) اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الْاَخْلَاقِ۔
اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں جھگڑے سے، دورخی سے اور بدخلقی سے۔

(۳۷) اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَالْكُفْرِ وَالْفُسُوْقِ وَالشِّقَاقِ وَالسُّمْعَةِ وَالرِّيَاءِ۔
اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں عاجزی سستی اور بخل سے اور کفر سے گناہ سے جھگڑے سے اور شہرت کی خواہش اور دکھاوے سے۔

(۳۸) اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْفَقْرِ وَالْفَاقَةِ وَالذِّلَّةِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ۔
اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں محتاجی سے فاقہ سے اور ذلت سے اور اس سے کہ میں ظلم کروں یا مجھ پر ظلم کیا جائے۔

(۳۹) اَللّٰهُمَّ ضَعْ فِيْ اَرْضِنَا بَرَكَتَهَا وَزِيْنَتَهَا وَسَكَنَهَا۔
اے اللہ ہماری زمین میں اسکی برکت زینت اور آبادی رکھ۔

(۴۰) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ اَوْسَعَ رِزْقِكَ عَلَيَّ عِنْدَ كِبَرِ سِنِّيْ وَانْقِطَاعِ عُمُرِيْ۔
اے اللہ میرے رزق میں سب سے زیادہ کشادگی میرے بڑھاپے اور میرے خاتمہ کے وقت پر کر۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَلَوَاتِكَ وَبَرَكَاتِكَ وَرَحْمَتَكَ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ

وَإِمَامِ الْمُتَّقِينَ وَخَاتَمِ النَّبِيِّينَ مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُولِكَ إِمَامِ الْخَيْرِ وَقَائِدِ الْخَيْرِ وَرَسُولِ الرَّحْمَةِ اَللّٰهُمَّ ابْعَثْهُ مَقَامًا مَحْمُودًا يَغْبِطُهُ فِيهِ الْأَوَّلُونَ وَالْآخِرُونَ ـ اَللّٰهُمَّ أَبْلِغْهُ الْوَسِيلَةَ وَالدَّرَجَةَ الرَّفِيعَةَ مِنَ الْجَنَّةِ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِي الْمُصْطَفَيْنَ مَحَبَّتَهُ وَفِي الْمُقَرَّبِينَ مَوَدَّتَهُ وَفِي الْأَعْلَيْنَ ذِكْرَهُ وَالسَّلَامُ عَلَيْهِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ ـ